

مشرق اور مغرب کی کشمکش

مؤلف

حضرت مولانا محمد عمران فاروقی صاحب
مظفر گڑھ

فاضل جامعہ خیر المدارس ملتان

بسم الله الرحمن الرحيم

In The Name of

ALLAH

The Most Beneficent and Merciful

انتساب

اللہ عزوجل ورسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم

کے بعد

پیارے والدین

اور

محترم اساتذہ کرام، بھائیوں، بہنوں اور احباب کے نام

جن کی بے پناہ شفقت، تربیت اور دعاؤں کی

بدولت آج میں اس مقام پر ہوں۔

فہرست

مقدمہ

قوموں کے عروج و زوال کا مسئلہ اتنا ہی اہم اور قدیم ہے جتنا کہ خود انسان کا مسئلہ تاریخ عالم پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ بابل و نینوا کو آباد کرنے والی قومیں عاد و ثمود جیسی پہاڑوں سے ٹکرانے والی طاقتیں۔ روم و ایران جیسی تہذیب و تمدن کی شمع روشن کرنے والی سلطنتیں اور نہ معلوم کتنی حکومتیں آسمان ترقی پر پہنچیں اور باغ و بہار کا مزہ لوٹنے کے بعد خاک میں مل گئیں۔

اجڑی ہوئی بستیاں، ظلم کی چکی میں پسنے والی قومیں، صحراؤں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غاروں میں گوشہ عافیت نہ پانے والی آبادیاں اور تمام گمنام و بے بس قومیں جو آج کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گزار رہی ہیں زبان حال سے شہادت دیتی ہیں کہ ان پر اقبال و فیروز مندی کا دور بھی گزر چکا ہے اور فتح مندی و کامرانی کے بعد ہی انہیں ذلت و نکبت سے دوچار ہونا پڑا۔

عروج و زوال کے بارے میں مسلم قوم کی تاریخ نہایت واضح اور مکمل نمونہ ہے یہ وہ قوم ہے جو اپنے عروج کے زمانے میں طوفان کی طرح اٹھی بجلی کی طرح چمکی اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی حکومت و مملکت کی حدیں اتنی وسیع کر لیں کہ سو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ مشرق میں سندھ و چینی ترکستان اور مغرب میں ہسپانیہ تک کو اپنے اقتدار میں لے لیا علوم و فنون کی ترقی کے لحاظ سے مدتوں ساری دنیا پر اپنی فوقیت و برتری کا بے داغ سکہ چلایا ذھنی و دماغی اور اخلاقی و مادی ہر لحاظ سے صدیوں ایسی کامیاب حکومت کی کہ اپنے پاور ہاؤس سے پرانی دنیا کے تینوں براعظم کو روشنی پہنچاتی رہی لیکن زوال کے دور میں اسی قوم پر فلاکت و ادبار مسلط ہو گیا، بازو شل اور دماغ جامد ہو گئے جہاد و اجتہاد کی طاقت ناپید ہو گئی اپنے وطن سے بے وطنی اور وطن میں رہ کر غریب الوطنی پر مجبور ہوئی ، مغرب میں قلعہ الحمراء و قصر الزہرا اور مشرق میں قلعہ

شاہجہانی و تاج محل عروج و زوال کی پوری داستان اپنے اندر لپیٹے ہوئے ہیں الغرض قوموں کی زندگی میں اس قسم کے نشیب و فراز اتار چڑھاؤ اور بناؤ بگاڑ ایک لا معلوم زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔ایسی حالت میں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اس کے پس پشت کچھ قوانین اور اسباب کارفرما ہیں یا یہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے اس کتاب میں اسی سوال کے نوک پلک درست کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی گئی ہے آخر میں قارئین کی خدمت میں انتہائی ادب سے عرض ہے کہ اگر یہ کتاب دل کے بند دریچے کھولنے میں معاون و مددگار ہو تو دعاؤں میں مت بھولیے گا اور اگر کوئی غلطی نظر آئے تو اس طالب علم کو اپنی کوتاہ علمی کا اقرار ہے البتہ آپکے اطلاع دینے سے اپنی اور کتاب کی اصلاح ہونے پر آپ کا ممنون و مشکور ہوں ں گا یہ ادنی سی کوشش بھی محض اللہ پاک کا فضل و کرم ہے ورنہ **"من دانم کہ من آنم"**

مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش

اس وقت تقریباً تمام مسلم ممالک میں ایک ذہنی کشمکش اور شاید زیادہ صحیح الفاظ میں ایک ذہنی معرکہ برپا ہے جس کو ہم اسلامی افکار و اقدار اور مغربی افکار و اقدار کی کشمکش یا معرکے سے تعبیر کر سکتے ہیں ان ملکوں کی قدیم تاریخ مسلم اقوام کی اسلام سے گہری وابستگی اور محبت اور جس نام پر جنگ آزادی لڑی اور جیتی گئی یا جس طاقت کے سہارے ان ملکوں کی آزادی کی حفاظت کی گئی سب کا دعوی ہے کہ اس سرزمین پر صرف اسلامی افکار و اقدار کا حق ہے جس کی اسلام نے دعوت دی ہے لیکن اس کے برعکس جس طبقہ کے ہاتھ میں اس وقت ان ممالک کی زمام کار ہے اس کی ذہنی ساخت اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی ذاتی و سیاسی مصالح کا تقاضا ہے کہ ان ممالک میں مغربی افکار و اقدار کو فروغ دیا جائے اور ان ممالک کو مغربی ممالک کے نقشِ

قدم پر چلایا جائے اور جو دینی تصورات، قومی عادات ضوابط حیات اور قوانین و روایات اس مقصد میں مزاحم ہیں ان میں ترمیم و تنسیخ کی جائے اور بالاختصار یہ کہ ملک و معاشرہ کو تدریجی طور پر لیکن عزم و فیصلہ کے ساتھ مغربیت کے سانچے میں ڈھال لیا جائے اس سلسلہ میں بعض ممالک اس سفر کی متعدد منزلیں طے کر چکے ہیں اور اپنی منزل مقصود پر یا تو پہنچ چکے ہیں یا اس کے قریب ہیں اور بعض ممالک ابھی دوراہے پر کھڑے ہیں لیکن آثار و شواہد بتلا رہے ہیں ؛؛ دل کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا؛ میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے یہ مسئلہ نہ فرضی ہے نہ خیالی مسلم ممالک کی اندرونی کمزوریوں اور مغربی تہذیب کے نفوذ و استیلاء کی کیفیت نے جس کی نظیر تہذیب انسانی میں مشکل سے ملے گی مسلم ممالک کے مادی و سیاسی اقتدار نے سارے مسلم ممالک کے سامنے اس مسئلہ کو نہایت روشن سوالیہ بنا کر کھڑا کر دیا ہے جس کا جواب سب کو دینا ہے اور اس سگنل کے بغیر کسی ملک کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے معاشرہ کو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زمانے کے قاہر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کون سی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس میں کس حد تک ذہانت و جرات کا ثبوت دیتے ہیں؟ اسی سوال کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ دنیا کے نقشہ میں ان قوموں کی نوعیت کیا قرار پاتی ہے ان ملکوں میں اسلام کا کیا مستقبل ہے اور وہ اس زمانہ میں اسلام کے عالمگیر و ابدی پیغام کے لیے کہاں تک مفید ہو سکتے ہیں؟

یہ مسلم زعماء اپنے مسلمان عوام کی طرف سے بڑی دقت اور مصیبت میں مبتلا ہیں اس لیے کہ وہ اپنے دینی اصولوں، ایمان کی دولت اور اپنی تاریخی میراث اور زندگی اور قوت کے اس عظیم سرچشمہ سے بے تعلق ہونے پر تیار نہیں ہیں جو اسلام نے ان کو عطا کیا ہے اور

مصلحین و مجددین امت نے اس کو باقی رکھنے کے لیے اپنا خون پانی ایک کیا ہے اس کے لیے ان کو ایک طویل المیعاد اور وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ کی کاروائی کرنا پڑ رہی ہے اور متعدد سمتوں سے مقابلہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے دوسری طرف خود مسلم قوم ان قائدین اور زعماء سے سخت نالاں اور پریشان ہے اس لیے کہ وہ اس کے مزاج اور ذوق سے ہمیشہ برسرِ جنگ رہتے ہیں وہ ان نعروں اور اعلانوں سے اس کی قیادت کرنا چاہتے ہیں جن کو قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہے اور جو اس کے اندر جوش اور امنگ پیدا نہیں کرتے وہ نہ اس کے لیے موت کو آسان اور زندگی کو دشوار بنا سکتے ہیں نہ جان و مال کی قربانی ہجرت، ترک وطن خواہشات اور شخصی انانیت پر قابو حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں قوم کی رگ حمیت کو چھیڑنے اور اس کے جذبات کو ابھارنے میں ان نعروں اور دعووں کی بے اثری اور ناکامی ان قائدین پر ظاہر ہو چکی ہے چنانچہ نازک اور سنگین لمحات اور فیصلہ کن معرکوں میں انہوں نے ہمیشہ دینی نعروں، اسلام کے راستے میں جہاد اور خدا کے راستے میں شہادت کے نعروں کی پناہ لی لیکن جب جنگ ختم ہو گئی اور ملک کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آئیں تو انہوں نے پرانے قومی اور وطنی نعرے دہرانے شروع کر دیے اور یہ فرض کر لیا کہ وہ ایک ایسی قوم پر حکومت کر رہے ہیں جو کوئی ایسا مذہب نہیں رکھتی جس سے اس کو عشق ہے اور وہ اس کے راستے میں جان تک دینے پر آمادہ ہے اور نہ کسی ایسے دینی جذبہ کی حامل ہے جو تھوڑی سی تربیت اور پرورش کے بعد دنیا کی سب سے عظیم طاقت بن سکتی ہے اور جس کے اندر بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں اس طرح ان اقوام کی طاقتیں، صلاحتیں اور ترقی کے امکانات ضائع ہو رہے ہیں جو اگر اچھی طرح استعمال کیے جاتے اور ان سے صحیح طور پر فائدہ اٹھایا جاتا اور یہ قائدین نظری سے زیادہ حقیقت پسند ہوتے تو ان سے عجیب کارناموں کا ظہور ہوتا اور آج اسلامی بلاک ہوتا اس کا سبب صرف ان قائدین کی کوتاہ نظری مغرب کی اندھی تقلید اور اپنے ملک میں اس کا جوں کا توں نافذ کرنے کا عزم ہے اور یہ نتیجہ ہے اس غیر ملکی ثقافت کا جس کو انہوں نے ملک سے باہر رہ کر حاصل کیا ہے یا خود

اپنے ہی ملک میں اس کو اچھی طرح ہضم کیا ہے اور اس کے سامنے اپنا سر تسلیم بالکل خم کر دیا ہے۔

اس وقت مغرب ایک اخلاقی جذام میں مبتلا ہے جس سے اس کا جسم برابر کٹتا اور گلتا جا رہا ہے اب اسکی عفونت پورے ماحول میں پھیلی ہوئی ہے اس مرض جذام کا سبب اس کی جنسی بے راہ روی اور اخلاقی انار کی ہے جو بہیمت و حیوانیت کی حدود تک پہنچ گئی ہے لیکن اس کیفیت کا حقیقی اولین سبب عورتوں کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی مکمل بے پردگی مرد و زن کا غیر محدود اختلاط اور شراب نوشی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب نے انسانی معاشرے کو اس جنگل سے بد تر بنا دیا جہاں کے حیوان بھی شرم و حیا اور اخلاقیات کا خیال کرتے ہیں خاندانوں کو توڑ کر قطع رحمی کے ایسے بیج ہوئے کہ خاندان تباہ ہو گئے اولاد والدین کو بھول گئے اور والدین اولاد کو بازاروں میں ماؤں کی ممتا کا جنازہ نکال دیا گیا بھائی بہنوں کے مقدس رشتے پامال ہو گئے بے شرمی بے حیائی، عصمت فروشی صفت بن گئی عوام کو حق حکمرانی دینے کا نعرہ لگانے والوں نے ان کو باپ کے شجرے سے ہی محروم کر دیا رزق کے نام پر ساری انسانیت کو سودی نظام میں جکڑ کر روٹی کے ٹکڑے تک کا محتاج بنا دیا اس میں شک نہیں کہ مغرب نے اپنی مشینوں کے سہارے آسمان کو چھوتی بلند و بالا عمارتیں تعمیر کر لیں لیکن ان کے مکین اخلاقی پستیوں کے ایسے گڑھے میں جاگرے جہاں انسانیت بھی شرمندہ ہو رہی ہے وقت نے ثابت کر دیا کہ دانش وران مغرب نے جو آشیانہ بنایا تھا وہ شاخ نازک پر ہی تھا آسمان گواہ ہے کہ تمہاری تہذیب اپنے ہی خنجر سے آپ خود کشی کر رہی ہے اس نتیجے کے پیشِ نظر کسی اسلامی ملک میں عورتوں کو ایسی ہی آزادی دی گئی پردہ یکسر اٹھا دیا گیا دونوں صنفوں کے اختلاط کے آزادانہ مواقع فراہم کئے گئے مخلوط تعلیم جاری کی گئی تو اس کا نتیجہ بھی اخلاقی انتشار جنسی انارکی سول میرج تمام اخلاقی و دینی حدود

و اصول سے بغاوت اور بالاختصار اس اخلاقی جذام کے سوا کچھ نہیں جو مغرب کو ٹھیک انہیں اسباب پر لاحق ہو چکا ہے ان اسلامی ملکوں میں جہاں مغربی تہذیب کی پرجوش نقل کی جا رہی ہے جہاں پردہ بالکل اٹھ گیا ہے مرد و زن کے آزادانہ مواقع حاصل ہیں پھر صحافت، سینما، ٹیلی ویژن موبائل فون لٹریچر اور حکمران طبقہ کی زندگی اس کی ہمت افزائی بلکہ راہنمائی کر رہی ہے وہاں اس جذام کے آثار و علامات پوری طرح ظاہر ہونے لگی ہیں یہ قانون قدرت ہے جس سے کہیں مفر نہیں۔

اسلامی معاشرہ تیزی کے ساتھ تغیر پذیر ہے جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایسے افراد کی جماعت پیدا ہو گئی ہے جو مسلمان ہیں تو اسلامی تہذیب سے عاری اور اگر یورپین ہیں تو کمر شکستہ، یورپ کا اثر یافتہ مسلمان بسا اوقات برائے نام تو مسلمان رہتا ہے لیکن فی الحقیقت عموماً وہ منکر الہیات ہوتا ہے اس کے اور صحیح عالم دین کے درمیان اتنی ہی بڑی خلیج حائل ہوتی ہے جتنی کہ ایک عالم اور یورپین کے درمیان سچ تو یہ ہے کہ یورپ کی تعلیمی چکی سے گزر کر نوجوان مسلمان اپنی اسلامیت یا کم از کم اس کا بہترین جزء کھو ہی بیٹھتا ہے وہ اپنے مذہب کے بنیادی عقائد کھو بیٹھتا ہے اس کو یقین نہیں رہتا کہ میں ہمہ وقت اپنے خالق کے سامنے ہوں جس کے سامنے کبھی نہ کبھی مجھے اپنے اعمال کا جوابدہ ہونا پڑے گا لیکن وہ اب اسلامی زندگی بھی اسلامی زندگی کے ان حصوں سے مستفید ہوتا رہتا ہے جو اس کی اخلاقی کمزوریوں کو برداشت کر سکتے ہیں اور جو معاملات زندگی میں اس کے مفاد اور سہولتوں سے تطابق رکھتے ہیں مسلمان آزاد خیال اس یورپین آزاد خیال سے بھی آگے بڑھا ہوا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک ایسے طوفانی سمندر میں پاتا ہے جہاں نہ کشتی ہے اور نہ ناخدا نہ تو اس کا ماضی اور نہ اس کا حال ہی اس پر کوئی پرزور اخلاقی رکاوٹیں حائل کرتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس کے ہم وطنوں کی اکثریت مذہب کو نہایت

مناسب اصلاحات کا مخالف تصور کرتی ہے اور اس مذہب کو جو کہ ایسے نامناسب نتائج کی طرف لے جاتا ہے نہایت غصہ اور ناراضی کے عالم میں پامال کر کے وہ مذہب کو مطلقاً چھوڑ بیٹھتا ہے اپنے مذہب سے علیحدہ ہو کر اپنے عریاں ذاتی مفاد کے کوئی دوسری رکاوٹ اس کو اخلاقی قوانین کی حدود میں نہیں رکھتی حالانکہ وہ یورپین جس کی وہ نقل کرنے کا کوشاں ہے اپنی قوم کے اخلاقی قوانین کا پابند رہتا ہے مسلمان کا سماج دروغ اور دھوکہ دہی کو پرزور طور پر ممنوع قرار نہیں دیتا مختلف قسم کی اخلاقی بدکاریوں پر سماجی بدنامی کا ڈر بھی عملاً اس پر اثر انداز نہیں ہوتا اپنے مذہب کو چھوڑ کر اس پر نظر بھی نہیں ڈالتا وہ آنکھیں بند کر کے یورپین تہذیب کے دامن کی طرف جھپٹتا ہے لیکن اس کو یہ علم نہیں ہوتا کہ مغربی تہذیب کا بظاہر نمایاں پہلو صرف اس کا بیرونی حصہ ہے۔

آج مسلمانوں کی نئی نسل جو پیرس برلن لندن امریکہ، آکسفورڈ یا خود اپنے ملک کی بعض جدید و مغربی طرز کی تعلیم گاہوں میں زیر تعلیم ہے اس کی نشوونما، دین کی بے وقعتی دینی مستقبل سے مایوسی اہل دین کی تحقیر ، مغربی تمدن کی غیر محدود تقدیس و عقیدت مادی اقدار اور مغربی رجحانات وخیالات کے سامنے مکمل سپر افگندگی پر ہوا ہے اس نسل میں دور رس اور بالغ نظر فکر کا فقدان ہے جو مغربی فلسفہ حیات کی تنقید پر قادر ہو اور یہ محسوس کر سکتا ہو کہ اس کے کمزور حصے کیا ہیں کس جگہ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے کیا چیزیں عالم اسلام کے مزاج، تاریخ، دنیا میں اس کے مقام و کردار سے مطابقت نہیں رکھتیں اور اس کے بلند قامت پر راست نہیں آتیں اس نسل کی قیادت زیادہ تر ان معلمین کی ہے جن کی ثقافت نہ وسیع ہے نہ گہری نہ آزاد جنہیں ان کی زندگی کے کچھ خاص تجربات، علماء اور قدامت پرست لوگوں کی سرد مہری بے توجہی جمود و تنگ نظری، قدیم نسل اور اس کے راہنماؤں میں نفاق اور قول و عمل کے تضاد

کا تجربہ کرنے اور ملک میں انحطاط و پسماندگی کے عام مناظر کے مشاہدہ نے ہر قدیم چیز اور ہر قسم کے موجود نظام سے متنفر و باغی بنا دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اسلامی ممالک میں ایک زبردست فکری انتشار پیدا ہوگیا وہ بنیادیں بالکل متزلزل ہو گئیں جن پر وہ باشعور و باصلاحیت معاشرہ قائم ہو سکتا تھا جس کو اپنے عقیدہ شخصیت اور تاریخ پر ناز ہو اور اس سے اس کو کارزارِ حیات میں قوت مقابلہ، ثابت قدمی، مکروہات پر صبر، دین کی حمیت عزت و ناموس کا پاس اور خود داری کا احساس حاصل ہو سکے اس کی جگہ شک و اضطراب بزدلی خوف و وبن عافیت پسندی اور راحت کوشی نے لے لی ہے تشکیک کی اس زبردست اور منصوبہ بند کوشش کے نتیجہ میں اور اس سستے ادب کے اثر سے جو جنسی جذبات اور نفسانی تسلی کے اصول پر قائم ہے پوری مسلم قوم اس معنوی قوت سے محروم ہوتی جا رہی ہے جو نازک وقتوں میں کسی قوم کا سب سے بڑا سہارا اور سب سے مؤثر طاقت ہوتی ہے، تشکیک و ذہنی انتشار نے تاریخ کے ہر دور میں مختلف قوموں کو سخت نقصان پہنچایا ہے بہت سی تہذیبیں اور قدیم تمدن محض اس کی وجہ سے بالآخر صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔

حکام کا رویہ

حکام کی صرف ایک ہی غرض وغایت ہے کہ جس طرح ممکن ہو رعایا کا خون چوس کر حکام کو غذا پہنچائی جائے رعایا کی بہبودی اور خوشحالی اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا خیال تک نہیں آتا رعایا کی تہذیب اور اخلاق کو درست کرنا اور ترقی دینا تو بڑی چیز ہے ملک کے مادی وسائل کو ترقی دینے کی بھی ان کو فکر نہیں ان حکام اور عہدہ داروں کو نہ عوام کی جان و مال کی پرواہ ہے نہ ان کی عزت و آبرو کا پاس لوگ شکایتیں کرتے ہیں لیکن جن لوگوں کے ہاتھ

میں حکومت کی باگ ڈور ہے ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی امراء اور رؤسا خواب غفلت میں پڑے ہیں لذت اندوزی کے سوا انہیں کسی بات کی فکر نہیں عیاشی کی وہ انتہا کہ قیاس کام نہیں کرتا تکلفات ،زندگی تعیشات اور سامان آرائش کی بہتات اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا جاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے ان میں ایک ایک شخص اپنی ذات اور لباس پر اس قدر خرچ کرتا ہے جس سے پوری ایک بستی کی پرورش ہو سکے آج کی دنیا کی کیفیت ایک ایسے مکان کی سی ہے جس کی بنیادیں ایک سخت زلزلے نے ہلا دی ہوں اس کی ہر چیز بے محل اور بے قرینہ ہے دیکھنے والوں کو یہاں ایسا انسان نظر آتا ہے جس کی نظر میں اپنی ہستی خود حقیر ہے وہ ہر بے بس چیز کو معبود بنا چکا ہے وہ اتنا مسخ ہو چکا ہے کہ روز مرہ کی کھلی ہوئی حقیقتوں کے ادراک سے بھی قاصر ہے اس کا فکری نظام مختل ہو چکا ہے اس کے احساسات غلط کام کر رہے ہیں دوست اور خیر خواہ کے ساتھ دشمنی اور دشمن اور بدخواہ کے ساتھ اس کی دوستی ہے معاشرے پر نظر ڈالیے تو اس معاشرے میں بھیڑیے کو گلہ کی نگہبانی اور ظالم فریق کو فصل خصومات کا کام سپرد کر دیا گیا ہے اس سوسائٹی میں مجرم خوش قسمت اور آسودہ ہے اور نیک سیرت زحمت و کلفت میں مبتلا ہے شراب نوشی بد مستی بد اخلاقی، جنون سود خوری لوٹ کھسوٹ اور مال کی محبت بوالہوسی اور جوع البقر تک پہنچ گئی ہے جو قابلیتیں انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی گئی ہیں وہ بڑی بیدردی سے ضائع کی جا رہی ہیں یا بے محل خرچ ہو رہی ہیں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور نہ ان کو صحیح رخ پر لگایا جاتا ہے عقل کا کام صرف اتنا رہ گیا کہ جرائم کے نئے نئے طریقے ایجاد کرے اور خواہشات کی تسکین کے لیے نئے نئے راستے پیدا کرے منظم قوموں کی جگہ بھیڑوں کے چند گلے نظر آتے ہیں جن کا کوئی چرواہا نہ ہو سیاست شتر

بے مہار ہے اور قوت ایک تلوار جو ایک بدمست کے ہاتھ پڑ گئی ہے جس سے وہ خود اپنے کو اور دوسروں کو زخمی کر رہا ہے۔

جب تک عالم اسلام کے کسی حصہ میں عام پسماندگی اور کمزوری پائی جاتی ہے جب تک اس کے بعض طبقوں کی غربت و افلاس کا یہ عالم ہے کہ اس کے لاکھوں افراد کو ایک وقت کا کھانا اور بدن ڈھکنے کے لیے کپڑا میسر نہیں جب تک ایک حلقہ میں بے اندازہ دولت اور بھرمارانہ زر اندازی اور عوام کی دولت کا بے حیائی کے ساتھ استعمال بے عقلی اور جنون کی حد تک جاری ہے جب تک امراء اور اہل ثروت کے نقش اور فسق و فجور کے افسوسناک قصے زیب داستان و نقل محفل بنے رہتے ہیں جب تک جہالت و ناخواندگی عام ہے اور عوام کا بڑا حصہ تعلیم سے محروم ہے اور عالم اسلام کی یہی صورت حال قائم رہتی ہے تو حساس طبیعتوں کا اس درد ناک صورت حال کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ ہو جانا ہر طرح قرین قیاس ہے محمد عاکف لکھتے ہیں لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصے تک سیاحت کی آخر تم نے کیا دیکھا؟ میں کیا بتاؤں کیا دیکھا میں نے اس سرے سے اس سرے تک ویران بستیاں، بے سری قومیں، ٹوٹے پھوٹے پل بند نہریں، سنسان سڑکیں دیکھیں میں نے جھریاں پڑے چہرے، جھکی ہوئی کمریں خالی دماغ بے حس دل الٹی عقلیں دیکھیں میں نے ظلم غلامی، خستہ حالی ریاکاری قابل نفرت برائیاں طرح طرح کی بیماریاں جلے ہوئے جنگل، ٹھنڈے چولہے، بنجر کھیت، میلی صورتیں، بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں۔ جب تک ان ممالک کے علماء دین اور راہنمایان ملت اپنے دینی فریضہ کی ادائیگی اور امراء اغنیاء کے سامنے کلمہ حق کہنے کی جراءت سے محروم ہیں اور مناصب و عہدوں کے لیے کشمکش یا غیر اہم اختلافی مسائل پر جنگ و جدال زور آزمائی اور رسہ کشی کی روایت بنی رہتی ہے جب تک دینی

تربیت زہد و تقوی، عزت نفس اخلاقی و دینی جرات کی عملی مثالیں تقریباً مفقود ہیں جب تک مخالف پروپیگنڈا، مخالف تحریکیں اور نظریات اسلامی معاشرے میں چور دروازے سے اور بعض اوقات علی الاعلان برابر داخل ہوتے رہتے ہیں اور ان کو عالم اسلام کی اس آبادی میں کام کرنے کا پورا موقعہ مل سکتا ہے وہاں کے اجتماعی، اقتصادی و اخلاقی حالات ان کو سہارا دیتے ہیں اور ان کے مقصد کو تقویت پہنچانے کا باعث بنتے ہیں جب تک یہ غیر فطری اور غیر اسلامی صورت حال ان اسلامی ممالک میں برقرار رہے گی اس وقت تک یہ ممالک اخلاقی و سیاسی انتشار سے دوچار اور سیاسی انقلابات کے لیے ہر وقت تیار رہیں گے یہ ممالک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہوئے ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظام تعلیم بھی ایک روح اور ضمیر رکھتا ہے یہ روح اور ضمیر دراصل اس کے واضعین و مرتبین کے عقائد و نفسیات زندگی کے متعلق ان کے نقطہء نظر ، مطالعہ کائنات و علم سماء کی اساس و مقصد اور ان کے اخلاق کا عکس اور پر تو ہوتا ہے جو اس نظام کو ایک مستقل شخصیت ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے یہ روح اس کے پورے ڈھانچے، ادب و فلسفہ، تاریخ و فنون لطیفہ، علوم عمرانیہ حتیٰ کہ معاشیات و سیاسات میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ اس کو اس سے مجرد کرنا بڑا کھٹن کام ہے یہ بہت بڑے صاحب اجتہاد اور اعلی تنقیدی صلاحیت رکھنے والے کا کام ہے کہ اس کے مفید اجزاء کو مضر اجزاء سے الگ کر کے ،، خذ ما صفا و دع ما کدر، پر عمل کرے اور اصل و زوائد میں فرق کر کے اس کا جوہر اور اس کی روح لے لے طبعی و تجربی (سائنٹفک) علوم میں یہ کام بہت زیادہ مشکل نہیں لیکن ادب و فلسفہ اور اور علوم عمرانیہ میں یہ کام بڑا مشکل اور نازک ہے خاص طور پر جب کوئی ایسی قوم جو متعین و محکم عقائد مستقل فلسفہ حیات اور مسلک ،زندگی اپنی ایک مستقل تاریخ

جو محض ماضی کا ایک ملبہ نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے لیے پیغمبر کی شخصیت اور اس کا زمانہ آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے جب کسی ایسی قوم یا دور کا نظام تعلیم قبول کرتی ہے جو اساس و بنیاد اور مثال و بلکہ اس کی ضد واقع ہوئی ہے تو قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے معیار میں اس سے مختلف اور ایک کی تعمیر دوسرے کی تخریب ایک کی تصدیق دوسرے کی نفی و تردید ایک کا احترام دوسرے کی تحقیر کے بغیر ممکن نہیں ایسی حالت میں پہلے ذہنی کشمکش عقائد میں تزلزل پھر اپنے دین سے انحراف اور قدیم افکار و اقدار کی بجائے پھر جدید افکار و اقدار کا آنا ضروری ہے یہ سب ایک قدرتی امر ہے اور بالکل قدرتی امور کی طرح اس کا پیش آنا ضروری ہے کسی قسم کی خوش نیتی، ضمیر کی خلش سرپرستوں کی خواہش خارجی و جزئی انتظامات اس امر کے وقوع میں خارج نہیں ہو سکتے اس کی رفتار کو سست اور اس کے وقوع کو مؤخر کر سکتے ہیں ملتوی نہیں کر سکتے درخت اگر اپنے طبعی نظام سے نشوونما پائے تو وہ اپنے برگ و بار ضرور پیدا کرے گا اور وقت پر پھل لائے گا انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ درخت نہ لگائیں یا اس کو پانی نہ دیں یا جب تیار ہو تو اس کی بستی کو ختم کر دیں مگر اس کا اختیار نہیں کہ ایک توانا و تندرست سرسبز و شاداب درخت کو اپنے نوعی وجود و لانے سے روک سکیں شخصیت کے اظہار اور وقت پر پھل پھول یہی معاملہ مغربی نظام تعلیم کا ہے وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے جو اپنے مصنفین و مرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکس ہزاروں سال کے طبعی ارتقاء کا نتیجہ، اہل مغرب کے مسلمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے یہ نظام تعلیم جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا تو اس سے ابتداء ذہنی کشمکش پھر اعتقادی تزلزل اور بعد میں الا ماشاء اللہ دینی ارتداد قدرتی ہے۔

اسلام اور مغربی تمدن جو زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے جب واقعہ یہ ہے کہ تو ہم کیسے اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی بنیادوں پر ایسی تعلیم و تربیت جو مجموعی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں اور ان کے تقاضوں پر مبنی ہے مخالف اسلام اثرات سے پاک ہو سکتی ہے ہماری توقع کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں اگر ہم بعض ایسے غیر معمولی حالات کا استثناء کر دیں جن میں کسی انتہاء درجہ کے روشن اور فائق دماغ کے لیے ایسا ممکن ہو کہ وہ اپنے درسی مضامین سے متاثر نہیں ہو سکا تو بھی عام اصول یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی تعلیم و تربیت ان کو اس قابل نہیں رکھے گی کہ وہ اپنے کو اس سے مخصوص ربانی تمدن کا نمائندہ سمجھیں جس کو اسلام لے کر آیا اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان روشن خیالوں کے اندر دینی عقائد برابر مضمحل ہوتے جا رہے ہیں جنھوں نے مغربی بنیادوں پر نشوونما حاصل کیا ہے مغربی ادبیات کی تعلیم کا انجام اس شکل میں جو اس وقت اکثر اسلامی اداروں میں رائج ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام مسلمان نوجوانوں کی نگاہ میں ایک اجنبی چیز بن جائے یہی بات بلکہ اس سے بہت زیادہ یورپ کے فلسفہ تاریخ پر صادق آتی ہے اس لیے کہ یورپ کا قدیم نظریہ تاریخ یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں رومی اور وحشی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا ایک پوشیدہ مقصد ہے وہ یہ کہ ثابت کیا جائے کہ مغربی اقوام اور ان کا تمدن ہر اس چیز سے زیادہ ترقی یافتہ ہے جس کا اس وقت تک وجود ہوا یا آئندہ کبھی دنیا میں وجود ہو سکتا ہے اس سے اہل مغرب کے حصول اقتدار کی کوشش اور مادی طاقت کا اخلاقی جواز پیدا ہوتا ہے اور وہ حق بجانب ثابت ہوتی ہے اگر مسلمانوں نے زمانہ ماضی میں علمی تحقیق و تفکر کے کام کو نظر انداز کر کے غلطی کی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس غلطی کی اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کا نظام تعلیم جوں کا توں

قبول کر لیں ہماری پوری تعلیمی پسماندگی اور علمی بے بضاعتی اس مہلک اثر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو مغرب کے نظام تعلیم کی اندھی تقلید اسلام کی مخفی دینی طاقتوں پر ڈالے گی اگر ہم اسلام کے جوہر کو یہ سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک مستقل علمی و تہذیبی عنصر ہے تو ہمارے لیے ضروری ہو گا کہ ہم مغربی تہذیب و تمدن کے ذہنی ماحول اور فضاء سے دور دور رہیں وہ فضا جو ہمارے معاشرہ اور ہمارے میلانات پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے تیار ہے مغرب کے طور و طریق اور اس کے لباس و مظاہر زندگی کو قبول کر لینے سے مسلمان آہستہ آہستہ مغرب کے نقطہء نظر کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے خارجی مظاہر کی تقلید اس ذہنی رجحان تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ مغربی نظام تعلیم در حقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں گہرے قسم لیکن خاموش نسل کشی کے مرادف ہے عقلاء مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے لیے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچہ میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے جابجا مراکز قائم کیے جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا اکبر مرحوم اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے ان کا مشہور شعر ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں   مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں!

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو   ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر **(ضرب کلیم)**

ایک اور جگہ فرماتے ہیں!

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم اک سازش ہےفقط دین و مروت کے خلاف **(ضرب کلیم)**

مسلم ممالک کی معاشی حالت بالعموم خستہ حال اور متزلزل ہے وہ دوسرے ممالک کے دست نگر اور ضروریات زندگی تک میں ان کے محتاج ہیں خاص طور پر ان ممالک کے عوام معاشی لحاظ سے اور معیار زندگی کے اعتبار سے بہت پست زندگی گزارتے ہیں جن ممالک میں آبادی زیادہ ہے ان کا معیار زندگی اور بھی پست اور ان کی معاشی حالت اور بھی خستہ اور زبوں ہے لیکن ان ممالک کی حکومتیں ترقی یافتہ اور مرفہ الحال مغربی حکومتوں کی پوری تقلید کرنے کی کوشش کرتی ہیں ہر ملک میں بضرورت اور بلا ضرورت سفارت خانے اور قونصل خانے قائم کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے پھر یہ سفارت خانے وہ تمام طریقے اختیار کرتے ہیں جو ان مغربی ممالک کے جو ان مغربی ممالک کے جو دینی و اخلاقی حدود و قیود سے یکسر بے نیاز ہیں سفارت خانے اختیار کرتے ہیں مسلم ممالک کے ان سفارت خانوں کی طرف سے مختلف تقریبات کے لیے شاہانہ دعوتوں اور کاک ٹیل پارٹیوں کا انتظام کیا جاتا ہے جن میں غریبوں سے جمع کی ہوئی دولت پانی کی طرح بہائی جاتی ہے سفارت خانوں کی طرف سے ان تقریبات میں شراب بالعموم اور کہیں کہیں،، لحم خنزیر،، بھی پیش کیا جاتا ہے بالعموم ان سفارت خانوں کو تبلیغ اسلام اور اپنے اخلاقی اصول و معیار، مسلمانوں کی ہمت افزائی اور دینی رہنمائی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور ان سے بہت کم علمی و ثقافتی فائدہ پہنچتا ہے بہت سے مسلم ممالک کے سربراہ سخت مسرفانہ زندگی گزارتے ہیں ان کے مصارف شاہانہ ہیں ان کے دورے قیصر و کسری اور زارا روس کی یاد تازہ

کرتے ہیں ان کی معاشرت اور طرز رہائش کو دیکھ کر الف لیلہ،، کے دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ہر گز یقین نہیں آتا کہ یہ غریب و خستہ حال ممالک کے سربراہ، ذمہ دار ہیں۔

نیز ان کا یہ طرز عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان ممالک کے راہنما باوجود اپنی وسیع عصری تعلیم و ثقافت اور بڑی بڑی ذمہ داریوں پر فائز ہونے کے ابھی دماغی لحاظ سے عہد طفولیت نقل و تقلید اور اپنے مغربی اساتذہ کی نیاز مندانہ شاگردی کے دور میں ہیں وہ آزادانہ طریقے پر سوچنے، جدت فکر، تخلیقی صلاحیتوں، ٹھوس اور سنجیدہ طریقہ کار سے محروم ہیں صرف اپنی قوم کے مزاج سے ناواقف اور اس کی طاقتوں سے ہی بے خبر نہیں بلکہ مغربی فکر کی ترقی و تبدیلی کا ساتھ دینے سے بھی قاصر ہیں اور مغربی سوسائٹی جس بے چینی، بے یقینی، بے دلی اور اکتابت کا شکار اور ایمان و روحانیت کی پیاسی ہے اس سے بھی بے خبر و ناواقف ہیں۔

مذہب کے ایک پرائیویٹ معاملہ ہونے پر اصرار جس کو سیاست و ریاست میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ، دین اسلام کے ساتھ مسیحی کلیسا کا معاملہ، مذہب و سیاست کی تفریق کا نظریہ، مذہب کو ترقی اکتشاف و تحقیق کی راہ میں حارج اور مخل سمجھنے کا خیال علماء اسلام کو مسیحی کلیسا کے ان نمائندوں کی صف میں کھڑا کرنا جو قرون وسطیٰ میں مطلق العنان اقتدار کے مالک تھے عورت کا بالکل مرد کے مساوی سمجھ کر اس کو زندگی کے تمام میدانوں میں دوڑنے اور حصہ لینے کا اہل اور مستحق سمجھنا، پردہ کو خواہ کسی شکل میں ہو مشرق کے قدیم حرم کے نظام کی یاد گار اور مردوں کے صنفی استبداد کا نشان سمجھنا اور اس کے ختم کرنے کو اصلاح و ترقی کا پہلا قدم تصور کرنا، اسلام کے قانون میراث اور ضابطہ نکاح و طلاق کو قرون وسطیٰ کے مسلمان فقہیوں کا اجتہاد اور اس محدود اور ابتدائی معاشرہ کا طبعی نتیجہ سمجھنا جو ساتویں آٹھویں صدی مسیحی میں قائم تھا اور اس کی تبدیلی و ترمیم اور مغربی اصولوں اور معیاروں کے مطابق بنانے کے کام کو وقت کا

ایک ضروری فریضہ قرار دینا ،سود ،شراب ، قمار، جنسی تعلقات میں آزادی و بے قیدی کو زیادہ معیوب نہ سمجھ کر نظر انداز کرنا قوم پرستی قدیم ماقبل اسلام تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کا جذبہ اور لاطینی رسم الخط کی افادیت و اہمیت پر یقین یہ اور اس طرح کے بہت سے رجحانات جو اس جدید تعلیم یافتہ نسل کے نزدیک حقائق و مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں اور روشن خیالی اور ترقی پسندی کی علامت ہیں مغربی تعلیم اور اس کے ذہنی و فکری ماحول اور فضاء اور اس کے تاریخی ورثہ کا نتیجہ ہیں آپ کو کمال اتاترک کے ترکی سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمان ممالک کے جتنے سربراہ اور راہنما نظر آئیں گے وہ سب اسی مغربی نظام تعلیم کی پیداوار ہیں ان میں سے جن کو براہ راست کسی مغربی ملک یا یورپ کے کسی مشہور تعلیمی مرکز میں پڑھنے اور پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا انہوں نے اپنے ملک میں رہ کر اس نظام تعلیم سے اس کے مخلص نمائندوں کی نگرانی و سرپرستی میں پورا فائدہ اٹھایا ان میں سے متعدد اشخاص نے ملٹری کالجوں میں تعلیم پائی جہاں مغربی طرز کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کیا جاتا ہے اس بنا پر آج عالم اسلام میں دو ذہنوں، دو فلسفوں، دو معیاروں اور دو رخوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اور جو عام طور پر منتج ہوتی ہے زیادہ طاقتور مسلح صاحب اختیار و اقتدار گروہ کی کامیابی پر، وہ بالکل قدرتی ہے وہ اگر ہے تو خواہ کتنے تاسف کی بات ہو تعجب کی بات نہیں تعجب اس وقت ہوتا جب یہ کشمکش اور تجدد و مغربیت کا رجحان پایا نہ جاتا۔

مطالبہ کفار

ہمارے اور آپ کے درمیان صلح کی یہی ایک صورت ہے کہ نفرت آمیز اور امن و بھائی چارگی کو خراب کرنے والی باتیں بند کی جائیں اس کے لیے ضروری ہے کہ اس قرآن کے علاوہ اور قرآن لے کر آیئے جس میں لات و منات و عزیٰ کی عبادت ترک کرنے کی بات نہ ہو

یا اسی قرآن میں تبدیلی کیجیے یعنی ایسی باتیں نکال دیجیے جن میں ہمارے نظام اور معبودوں کی برائی کی گئی ہے ،، قل مایکون لي ان ابدلہ من تلقاء نفسی، اللہ پاک نے فرمایا کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بتا دیجیے میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اس میں اپنی جانب سے تبدیلی کر دوں ، یعنی ماننا ہے تو اسی کو ماننا ہوگا مصالحت کی کوئی اور صورت ناممکن ہے آج کفر و اسلام ایک کرنے مصالحت کے نام پر میلے ٹھیلے سجائے جاتے ہیں اتحاد و یگانگت مصالحت و ہم آہنگی کی باتیں کی جاتی ہیں عقل اس وقت حیران رہ جاتی ہے جب ان میلوں اور بازاروں میں علم دین کی طرف منسوب لوگ بھی نظر آتے ہیں جو تصویریں بنوا کر دنیا کو بھی اس پر گواہ بنا رہے ہوتے ہیں بھائی سیدھی سی بات ہے پاک و ناپاک کا مرکب تو ناپاک ہی ہوتا ہے اصل بات یہ ہے کہ امپریلزم کی کوشش یہ ہے کہ ہم صرف نماز روزہ کرتے رہیں اور ہماری زندگی میں اسلام صرف عبادات تک محدود رہے تاکہ ہمارا اس سے کبھی سیاسی ٹکراؤ نہ ہو امپریلزم ہم کو دعوت دیتا ہے ہم نماز پڑھتے رہیں جتنا جی چاہے اور ہمارے پٹرول پر اس کا قبضہ رہے ہماری نماز سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہے اگر ہمارے بازار اس کے مال کے لیے ہمارا سرمایہ اس کے تاجروں کے لیے اور مصنوعات کے لیے وقف ہو اسی لیے حملہ آوروں نے اپنے قوانین اپنا نظام حیات ہم پر تھوپ دیا اور ہم کو یہ بہلاوا دیا کہ اسلام زندگی کے لیے ناقابل عمل ہے وہ جانتے ہیں کہ مذہب کوئی درخت نہیں جسے کاٹ دیا جائے تو سوکھ کر ختم ہو جائے گا مذہب کسی کتاب یا کتابوں کے انبار کا نام نہیں جسے جلا دیا جائے تو جل کر راکھ ہو جائے گا مذہب عقائد و نظریات کا نام ہے جو انسان کے ذہن و دل میں محفوظ ہوتے ہیں اور انسان کو اپنا پابند بنائے رکھتے ہیں بس مذہب کو ختم کرنے بگاڑ دو رنے کے لیے ذہن : مذہب کی گرفت خود بخود ڈھیلی ہونا شروع ہو جاتی ہے

الغزو الفکری کا تعارف

دنیا میں جنگ کے دو طریقے مروج رہے ہیں ایک جنگ وہ ہے جو فوج، اسلحے، اور خطرناک ہتھیاروں کے ساتھ لڑی جاتی ہے دوسری جنگ وہ ہے جس میں خونریزی نہیں ہوتی مگر عقائد و نظریات پر حملہ کیا جاتا ہے دوسری قسم کو الغزو الفکری فکری و نظریاتی جنگ کہا جاتا ہے یعنی ھو الغزو بالوسائل الغیر العسکریہ۔یہ ایک ایسی جنگ ہے جو روایتی ہتھیاروں کو چھوڑ کر دیگر وسائل سے لڑی جاتی ہے الغزو الفکری کا مقصد کسی قوم کو ذہنی و شعوری طور پر مردہ کر کے اسے اپنے سانچے میں ڈھال لینا اعدائے اسلام کا ہدف ہے علم الغزو الفکری کی اہمیت دور حاضر میں تمام عالمی طاقتیں مجتمع ہو کر اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ مسلمانوں پر عسکری و نظریاتی دونوں میدانوں میں حملہ آور ہیں لہذا مسلمانوں کو اس علم کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اپنی حفاظت کے لیے ہتھیاروں اور فوج کی عسکری و نظریاتی جنگ میں فرق عسکری اور نظریاتی جنگ میں کئی وجوہ سے بڑا فرق ہے۔

1۔ عسکری جنگ میں دشمن جانا پہچانا اور سامنے ہوتا ہے نظریاتی جنگ میں دشمن نامعلوم ہوتا ہے جو چھپ کر حملہ کرتا ہے ۔

2۔ عسکری جنگ میں دشمن کے اہداف معلوم ہوتے ہیں نظریاتی جنگ میں عموماً اہداف نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔

3 ۔عسکری جنگ میں حملہ اجسام عمارات اور فوجی اہداف پر ہوتا ہے نقصان صرف مادی ہوتا ہے نظریاتی جنگ میں حملہ اذہان قلوب اور خیالات پر ہوتا ہے نقصان مذہبی اور نظریاتی ہوتا ہے

جس کے بعد مادی نقصان بھی ضرور ہوتا ہے معلوم ہوا کہ نظریاتی جنگ عسکری جنگ سے زیادہ موثر، مہلک اور کارگر ہے۔

نظریاتی جنگ میں کفار کی مذموم کوششوں کا خاکہ

1. مخالفین کی مجلس مشاورت کا قیام
2. پیام حق میں وساوس و شبہات پیدا کرنا
3. تاویلات فاسدہ
4. جھوٹے پروپگنڈے
5. طعنے و استہزاء
6. القاب رذیلہ کی تشہیر
7. حوصلہ شکن بیانات
8. عجیب و غریب مطالبے کرنا
9. مسلمانوں کو ذہنی و جسمانی اذیتیں پہنچانا
10. خاندانی دباؤ اور دھمکیاں
11. سرداری
12. مال و دولت اور حسین عورتوں کا لالچ
13. سمجھوتے کا جھانسہ
14. سماجی بائیکاٹ
15. پروپیگنڈہ

16. شور شرابا
17. جلا وطنی
18. ذرائع ابلاغ کا استعمال ، اشعار اور تقاریر
19. مباحثے
20. منافقت
21. جاسوسی وغیرہ

مسلمانوں کا دفاعی اور جوابی لائحہ عمل

1. خالق سے تعلق
2. مخلوق کی خیر خواہی
3. اپنی علمی و عملی تربیت
4. ذرائع ابلاغ کا استعمال اشعار تقاریر
5. مباحثے
6. جاسوسی

مسلمانوں کے غلبہ اور دشمنوں کی ناکامی کی وجوہ

1. مسلمانوں کا اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور سنت سے رشتہ مضبوط ہونا۔
2. مسلمانوں میں علم کی گہرائی ہونا
3. سیاسی غلبہ حاصل کا ہونا
4. دینی حمیت اور اپنے دین و ایمان کے بارے میں بے حد حساس ہونا خصوصاً مسلم حکمران
5. اعلیٰ اخلاق و کردار کا حامل ہونا۔

مغربی مستشرقین اور ان کا اثر استشراق کی تعریف

اہل مغرب کا مشرقی اسلامی دنیا کی تہذیب مذاہب ،ادب، لغت، تاریخ، ثقافت اور عادات و اطوار کی تعلیم حاصل کرنا مستشرق وہ مغربی دانشور ہیں جو مذہبی تعصب کی بناء پر علوم اسلامیہ کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ اسلام کے مصادر میں آمیزش کی جائے اسلام کی روح کو متاثر کیا جائے اور اس کی شکل وصورت کو بگاڑ کر اس کی عظمتوں کو داغدار کیا جائے موجودہ عالم اسلام کے راہنما و حکمران طبقہ کے جس نے عام طور پر اعلیٰ مغربی تعلیم گاہوں میں تعلیم پائی ہے یا مغربی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے دماغوں میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی اس کے حال کی طرف سے بیزاری اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی، اسلام و پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ماخذ کے بارے میں شکوک و شبہات اور اصلاح مذہب، اصلاح قانون اسلامی کے اس طرز پر آمادہ کرنے میں بہت بڑا حصہ ان علماء مغرب کا ہے جنہوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے لیے اپنی زندگیاں : وقف کر دی ہیں اور ان کو عام کہا جاتا ہے اور جو اپنے علمی تبحر تحقیقی انہاک (orientalist) طور پر مستشرقین اور مشرقیات سے گہری واقفیت کی بنا پر مغرب و مشرق کے علمی و سیاسی حلقوں میں بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان مشرقی اسلامی مباحث و مسائل میں ان کی تحقیق و نظریات کو حرف آخر اور قول فیصل سمجھا جاتا ہے ان کا بڑا مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئ نسل کے لیے مسیحیت میں کشش پیدا ہو چنانچہ اکثر استشراق اور تبلیغ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں مستشرقین کی بڑی تعداد اصلا پادری ہے ان میں سے ایک بڑی تعداد مذہبا یہودی ہے

مستشرقین کا سیاسی محرک

ان کا سیاسی محرک یہ ہے کہ یہ مستشرقین عام طور پر مشرق میں مغربی حکومتوں رہے ہیں مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور (pioneers) اور اقتدار کا ہر اول دستہ رسد پہنچانا ان کا کام ہے وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج طریق باند و بود اور زبان و ادب بلکہ جذبات و نفسیات کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات بہم پہنچاتے ہیں تاکہ ان پر اہل مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو اسی کے ساتھ ساتھ ان حالات و تحریکات عقائد و خیالات کا توڑ کرتے رہتے ہیں جو ان حکومتوں کے لیے پریشانی اور درد سر کا باعث ہیں اور ایسی ذہنی و علمی فضاء پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں ان حکومتوں کی مخالفت کا خیال ہی پیدا نہ ہونے پائے اس کے بالمقابل ان کی تہذیب کی عظمت اور ان کی خدمات کی وقعت پیدا ہو اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی اور ان کو مغرب کے نقش قدم پر لے چلنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ ان مغربی حکومتوں کے ہٹ جائے پر بھی ان کا ذہنی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے اسی بناء پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح محسوس کیا اور ان کے سربراہوں نے ان کی پوری سرپرستی کی اور اسی مقصد کے ماتحت مختلف ممالک کے مستشرقین عالم اسلام سے متعلق رسائل و مجلات شائع کرتے ہیں۔

سیاسی و استعماری اہداف و محرکات

1. اسلامی عادات و معاشرت کا مطالعہ کرنا۔اسلامی معاشرے کی تہذیب و ثقافت اور ادب و آداب اور اقدار کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی جاتی ہے تاکہ زمینی حقائق کے مطابق اپنی حکومتوں کی راہنمائی کریں۔

2. اسلامی ممالک کی زبانیں سیکھنا اسلامی ممالک میں رائج زبانیں سیکھ کر ان کو سیاست سفارت تجارت اور جاسوسی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

3. عربی زبان پر وار مسلمانوں کو ان کے مذہب کے مآخذ سے دور رکھنے کے لیے عربی زبان سے ان کا رشتہ ختم کر دینا چاہتے ہیں عربی کی فصاحت پر اعتراضات کرنے اور اس میں یورپی الفاظ ٹھونس کر اس کی اصل شکل کو بگاڑ دینے کی کوشش کر رہے ہیں.

4. عرب ممالک میں عربی کی بجائے وہاں کی قدیم متروکہ زبانیں پھیلانا۔ عرب دنیا کی اپنی پہچان ختم کرنے کے لیے قدیم اور متروک زبانوں کو زندہ کیا جا رہا ہے۔

5. غیر مسلموں کی زبانوں اور بازاری لہجوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہندوستان اور بنگلادیش میں مسلمانوں کی زبان اردو اور بنگلہ کے مقابلے میں ہندی زبان کو فروغ دینے کی کوششیں بہت کامیاب جا رہی ہیں پاکستان میں انگریزی ہندی اور سکھوں کی زبان پر کامیابی سے کام جاری ہے نیز پاکستان میں بھارتی میڈیا کے ذریعے سوقیانہ (بازاری زبان کو فروغ دے دیا گیا ہے۔

6. عالم اسلام میں یورپین زبانوں کی اشاعت کرنا مراکش میں ہسپانوی الجزائر میں فرانسیسی لیبیا میں اطالوی اور پاک وہند سمیت اکثر اسلامی دنیا میں انگریزی کو فروغ دے دیا گیا ہے جس کی وجہ سے عالم اسلام کی مقامی زبانیں شدید خطرے سے دو چار ہیں۔

7. مسلمانوں کے مختلف قبائل، ممالک حکومتوں اور طبقات کے درمیان نفرت کی آگ بھڑکانا۔ عالم اسلام کے ایک طبقے کو دوسرے طبقے سے ایک برادری کو دوسری برادری سے اور ایک ملک کو دوسرے ملک سے مستقل طور پر متنفر کر دینے کے لیے تحقیق

کتب لکھی جا رہی ہیں تا کہ مسلمان آپس کے اختلافات میں الجھے رہیں اور سیاسی طور پر کبھی متحد اور مضبوط نہ ہو سکیں۔

8. مغربی دنیا کو چمکا دمکا کر پیش کرنا اور ان کی عظمت ثابت کرنا مستشرقین کی کتب پڑھ کر ایک عام مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ انسانوں کے نہیں جانوروں کے بیچ آباد ہے اور انسان صرف یورپ میں پائے جاتے ہیں مسلمانوں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ دین داری اور دین داروں سے دور رہ کر مغرب کی اندھا دھند نقالی میں اپنی عزت سمجھیں۔

9. مسلمانوں کو کمزور اور جاہل قرار دینا اکثر مستشرقین مسلمانوں سے ہمدردی کا پیرایہ اختیار کر کے ان میں جان بوجھ کر مایوسی پھیلاتے ہیں یہ لٹریچر پڑھ کر ایک عام مسلمان یہ سمجھنے لگتا ہے عالم اسلام کی دنیا میں کوئی حیثیت نہیں ہے اور مسلمان قوم ناقابل اصلاح ہے۔

10. جہاد کی غلط تاویلات کرنا مغرب کو ہمیشہ مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے خوف لاحق رہا ہے اس لیے مستشرقین مسلمانوں کو جہاد سے دور رکھنے کے لیے طرح طرح کی تاویلات فاسدہ سکھاتے ہیں ۔

مستشرقین کا تجارتی و اقتصادی محرک

استشراق کا ایک اہم محرک اقتصادی بھی ہے مغربی ناشرین تجارتی نفع کے پیش نظر مشرقی موضوعات پر تصنیفی و تحقیقی کاموں کی سرپرستی کرتے اور کتابیں چھاپ کر پوری دنیا میں فروخت کرتے ہیں اس طرح انہیں بے تحاشا دولت حاصل ہوتی ہے بہت سے فضلاء اس کو ایک کامیاب

پیشہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں طریقہ واردات قرآن و حدیث، فقہ، تاریخی کتب سفر ناموں، شاعری غرض ہر طرح سے مواد چن کر پھر ایک بے اصل بات کو ملمع کاری کے ذریعے ایسی آن بان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ کہنے میں کوئی بات نہیں کہ قرآن و حدیث سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ اسلامی اور اخلاق و تصوف کے وسیع مطالعہ نے ان کے قلب و دماغ پر کوئی بڑا انقلاب انگیز اثر نہیں ڈالا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول و غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشان دہی اور ان کو نہایت مہیب شکل میں پیش کرنے میں صرف کرتے ہیں وہ خود خوردبین سے دیکھتے ہیں اور قارئین و ناظرین کو دوربین سے دکھاتے ہیں رائی کا پربت بنانا ان کا ادنی کام ہے وہ اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں اس سبک دستی، ہنر مندی اور صبر و سکون سے کام لیتے ہیں جس کی نظیر ملنی مشکل ہے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے ہر اس بات کو جس سے ذرا بھی مطلب براری ہے خواہ وہ صحت و استناد کے حوالے سے کتنی ہی مجروح و مشکوک اور بے قیمت ہو اس کو بڑے آب و تاب سے پیش کرتے ہیں ان کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، اسلامی تہذیب کو نقصان پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں۔

کامیابیوں کی وجوہ

1. مسلمانوں کی جہالت
2. انگریزی سے مرعوبیت
3. مسلمانوں کے علمی طبقے کا سکوت
4. بے سروسامانی حوصلہ شکنی
5. مستشرقین کے لیے سہولیات اور حکومتی سرپرستی

استعمار یا سامراجیت

استعمار یا سامراجیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی علاقے پر اپنے ایجنٹ مسلط کر کے اس طرح تسلط حاصل کرنا کہ مقامی وسائل کو لوٹا جاتا رہے یا ایسے نظام کو فروغ دینا ہے جس میں ایک ملک دوسرے ملک کے معاملات کو کنٹرول کرے مغرب کی سامراجی طاقتوں نے مشرقی ممالک میں اخلاقی انتشار پھیلانے اور تشکیک پیدا کرنے کی منظم کوشش کی مسیحیت کا حلقہ بگوش، مغرب، مسیحیت کے بارے میں خواہ کتنا ہی متشکک و ارتیابی واقع ہوا ہو مسیحی عقائد کے بارے میں اس کی روشن خیالی و وسیع نظری خواہ الحاد و زندقہ کے حد تک پہونچی ہوئی ہو لیکن مسلم اقوام اور عالم اسلام کے معاملے میں وہ کٹر مسیحی واقع ہوا ہے وہ اس کے معاملے میں اپنے جنم دشمن اور خون کے پیاسے یہودیوں تک سے مصالحت کر سکتا ہے اور ان کو مسلمانوں پر کھلی ترجیح دے سکتا ہے اس مذہبی تعصب کے علاوہ جو اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے اور جو تقریباً اس کا مزاج بن چکا ہے اس کو اپنا مفاد بہر حال ہر چیز سے عزیز ہے یہ بارہا کا تجربہ ہے کہ کسی اسلامی طاقت کی جب کسی غیر اسلامی طاقت سے ٹکر ہوئی ہے تو اس نے ہمیشہ غیر اسلامی طاقت کا کھل کر ساتھ دیا اس کی درپردہ مدد کی جون 1967 عیسوی کے عرب یہود تصادم نے اس بات کو روز روشن کی طرح ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کی کسی ملت یا جماعت کو کسی مغربی یا مشرقی بلاک سے کسی مخلصانہ مدد اور مکمل رفاقت کی امید نہیں رکھنی چاہیے اس کو اپنے ہر اقدام اور فیصلہ کے وقت خدا کے بعد اپنے ہی دست و بازو اور وسائل پر اعتماد کرنا چاہیے۔

اہداف

1۔ اسلامی خلافت کا خاتمہ جو ہو چکا ہے اور اب اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے کہ دوبارہ کہیں یہ خواب مسلمانوں میں بیداری کا سبب بن کر شرمندہ تعبیر نہ ہو۔

2۔ مقامات مقدسہ پر قبضہ جو تقریباً ہو چکا ہے اور جو کچھ مقامات بچے ہوئے ہیں ان پر دھیرے دھیرے مگر تسلسل کے ساتھ قبضہ کرنے کا کام جاری ہے

3۔ عالم اسلام پر قبضہ یہ بھی تقریباً ہو چکا ہے اور وہ تمام عالم اسلام کو اپنی مٹھی میں لے چکے ہیں سوائے چند ایک کے اور باقی ممالک میں جو تھوڑی بہت آزادی باقی ہے وہ بھی ہر چند ہے کہ نہیں ہے اس کو سلب کرنے کا کام تیزی سے جاری ہے۔

4 ۔ عالم اسلام کو فنا کر دینا۔

5 ۔ اسلامی دنیا کا اقتصادی و عسکری محاصرہ۔

6۔ عالم اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔

انتشار باقی رکھنے کے حربے

1. اقوام متحدہ کا شکنجہ
2. بین الاقوامی قوانین
3. معاہدے
4. مسلمانوں پر مسلط کی گئی جنگیں
5. بلاکس
6. اسلامی دنیا میں بھڑکائی گئی جنگیں
7. سیکورٹی
8. جمہوریت کا فروغ اور کٹھ پتلی حکمران
9. سیاسی و لسانی پارٹیوں کا فروغ

10. لسانیت و صوبائیت پرستی

11. مذہبی فرقہ بندی کا فروغ

12. جعلی لیڈر شپ تیار کرنا

عالم اسلام کے تشخص کے خاتمے کے ہتھکنڈے

1. گمراہ کن مفکرین کی تیاری
2. استعمار کی اطاعت کی تلقین
3. فاسد اور غلط تاویلات کے ذریعے جہاد کے تصور کو ختم کرنا
4. اسلامی عقائد کو بدل کر استعمار کی اغراض کے مطابق بنانا
5. جمہوری نظریے کا فروغ
6. مسلمانوں کی ثقافت کو مجروح کرنا

عالمگیریت

گلوبلائزیشن عالمگیریت ایک ایسی تحریک ہے جس کا مقصد اقتصادی، ثقافتی، معاشرتی ،دینی قومی اور وطنی امتیازات کو ختم کر کے پوری دنیا کو یہودی اہداف اور امریکی نظریے کے مطابق جدید سرمایہ دارانہ نظام کے دائرے میں لانا ہے اسی تناظر میں پوری دنیا بالخصوص عالم اسلام سے یہ مطالبہ پوری شد و مد کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ اب اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائے اس میں مزید تاخیر نہ کی جائے اکثر اسلامی ممالک نے تو گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اور باقاعدہ طور پر تسلیم بھی کر چکے ہیں جو باقی ہیں ان میں اس سوچ کو پروان چڑھایا جا رہا ہے کہ اس کو تسلیم کرنے میں کوئی مذہبی رکاوٹ ہے نہ سیاسی و ملکی اور نہ ہی یہ معاشی طور پر درست ہے کہ ساری دنیا ایک پیج پر کھڑی ہو اور چند ملک دوسرے پیج پر آیئے دیکھتے ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات کی

نوعیت کیا ہے اسرائیل کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ، آیت ولایت کی وجہ سے نہیں بلکہ اگر اس آیت کریمہ کو اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات کی ممانعت میں پیش کیا جائے تو خلط مبحث ہو گا اور مسئلہ کو زیادہ الجھا دینے کی کوشش ہوگی اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ سفارتی تعلقات سے اختلاف کی وجوہ مختلف ہیں

1۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری وہاں کی صدیوں سے چلی آنے والی آبادی یعنی فلسطینیوں کی رضا مندی کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ پہلے برطانیہ نے اس خطہ پر 1917 عیسوی میں باقاعدہ قبضہ کر کے فوجی طاقت کے بل پر یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا ہے اور اب امریکہ اور اس کے اتحادی پوری فوجی قوت استعمال کر کے فلسطینیوں کو یہودیوں کی اس جبری آبادکاری کو تسلیم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں جس پر فلسطینی راضی نہیں ہیں کیونکہ یہ دھونس اور جبر کا راستہ ہے جسے دنیا کی کوئی مہذب اور متمدن قوم قبول نہیں کر سکتی میرا خیال ہے کہ جس طرح ہم کشمیر کے بارے میں اصولی موقف رکھتے ہیں کہ بھارتی فوج وہاں سے چلی جائے اور کشمیریوں کو کسی دباؤ کے بغیر اقوام متحدہ کے نظم کے تحت اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے اسی طرح فلسطین بلکہ پورے مشرق وسطیٰ کے بارے میں ہمارا اصولی موقف یہ ہونا چاہیے کہ امریکہ و یورپ اپنی فوجیں اس خطے سے نکالے اور نہ صرف فلسطین بلکہ خلیج کے دیگر ممالک کو بھی فوجی دباؤ سے آزاد کر کے وہاں کے عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا آزادانہ موقع فراہم کرے انصاف اور مسلمہ اصولوں کا تقاضا تو بہرحال یہی ہے اور اگر بالا دست قوتیں طاقت کے نشے میں اس اصول پر نہیں آتیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے مؤقف سے دستبردار ہو جائیں اور بے اصولی اور دھونس کو اصول و قانون کے طور پر تسلیم کر لیں

2۔ پھر اسرائیل کو تسلیم کرنے میں ایک عملی رکاوٹ یہ بھی ہے جسے دور کیے بغیر اسے تسلیم کرنا قطعی طور پر نا انصافی کی بات ہو گی وہ یہ کہ اسرائیل کی سرحدی حدود اربعہ کیا ہوں گی یہ بات ابھی تک طے نہیں ہو سکی بہت سے عرب ممالک اور فلسطینی عوام کی اکثریت سرے سے فلسطین کی تقسیم کو قبول نہیں کر رہی اقوام متحدہ نے اسرائیل اور فلسطین کے درمیان جو سرحدات اپنی قرار دادوں میں طے کر رکھی ہیں انہیں اسرائیل تسلیم نہیں کر رہا اسرائیل کی اقوام متحدہ کی طرف سے طے کردہ سرحدات اور ہیں اس وقت اس کے زیر قبضہ علاقے کی حدود اربعہ اور ہیں کسی اصول اور قانون کی پرواہ کئے بغیر پورے فلسطین میں دندناتے پھرنے سے اس کی سرحدوں کا نقشہ بالکل دوسرا دکھائی دیتا ہے اور اسرائیلی حکمرانوں کے عزائم پر مشتمل عظیم تر اسرائیل کا جو نقشہ ریکارڈ پر موجود ہے وہ ان سب سے مختلف ہے اس کے ساتھ سابقہ اسرائیلی وزیر اعظم شیرون کا یہ اعلان کئی بار سامنے آ چکا ہے کہ وہ فلسطین کی مجوزہ ریاست کو صرف اس شرط پر تسلیم کریں گے کہ اس کی سرحدات کا تعین نہیں ہو گا اور اس کی الگ فوج نہیں ہو گی اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسرائیل پورے فلسطین پر حکمرانی کے حق کا اعلان کر رہا ہے اور فلسطینیوں کو سرحدات کے تعین کے ساتھ کوئی چھوٹی سی برائے نام ریاست دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہے اس کے ساتھ اسرائیل کو تسلیم کرنے سے قبل آپ کو بیت المقدس کے بارے میں 3. بھی اپنے مؤقف پر نظر ثانی کرنی ہو گی اور اس کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو اسرائیل کو بیت المقدس سے دستبرداری آمادہ کر لیں اور یا خود یوٹرن لے کر پر دستبرداری کا فیصلہ کر لیں یہ تینوں رکاوٹیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے پریکٹیکل ہیں عملی ہیں اور معروضی ہیں ان کا کوئی باوقار اور قابل عمل حل نکالیں اب ہم آتے ہیں اپنے اصل موضوع کی طرف کہ عالمگیریت کا اصل حدف اسلام اور عالم اسلام کیوں ہیں۔

وجوہات:-

1 پوری دنیا میں اسلامی ممالک جغرافیائی لحاظ سے بہترین خطوں میں واقع ہیں۔

2 اسلامی دنیا حیرت انگیز معدنی وسائل سے مالامال ہے۔

3 تین بڑے مذاہب ، اسلام نصرانیت اور یہودیت کے مقامات مقدسہ اسلامی دنیا میں واقع ہیں۔

4. عالمگیریت کو صرف اسلام سے خطرہ ہے۔

عالمگیریت کے میدان

1۔ سیاسی عالمگیریت مثلاً نیو ورلڈ آرڈر۔

2۔ اقتصادی عالمگیریت۔

اس مقصد کے لیے چار اہم اقدامات کیے گئے ہیں۔

i. سونے کے ذخائر پر قبضہ۔

ii. عالمی تجارتی اداروں کا قیام۔

iii. تجارت سے متعلقہ عالمی معاہدے۔

iv. ملٹی نیشنل کمپنیوں کا فروغ۔

3۔ تہذیبی و ثقافتی عالمگیریت۔

4 ۔معاشرتی عالمگیریت۔

سیکولرزم لادینیت

دین کو زندگیوں اور حکومت سے الگ کرنا۔

اہل مغرب کے نزدیک خدا کا تصور یہ ہے کہ خدا بادشاہ تو ہے مگر ایسا بادشاہ جو حکومت نہیں کرتا یعنی نہ کسی چیز سے روک سکتا ہے نہ کسی چیز کا امر کر سکتا ہے مغرب کی مسیحی فکر اللہ اور قیصر کو دو جدا حصوں میں بانٹ دیتی ہے مگر اسلام میں حکمران صرف اللہ کا بندہ ہوتا ہے اس کے تمام اوامر و نواہی کا پابند ہوتا ہے اسلام میں انسانی زندگی کی یہ تقسیم ہی نہیں کہ یہ امور دینی ہیں اور یہ غیر دینی دین و دنیا کی تقسیم ہی غیر اسلامی اور مسیحی مغرب سے درآمد شدہ ہے اسلامی قانون انسانی زندگی کے حلال و حرام کو بھی بیان کرتا ہے اور حیات انسانی کے خاندانی دائرے میں رہتے ہوئے حقوق و فرائض بھی متعین کرتا ہے اسلامی قانون جس طرح لوگوں کے مابین واقع ہونے والے معاشرتی معاملات اور مبادلات کو منظم کرتا ہے اسی طرح ادارتی مالی اور سیاسی اور حکومت و رعایا کے مابین تعلقات و معاملات کی تفصیل بھی بیان کرتا ہے اور امت مسلمہ کے دیگر اقوام کے ساتھ صلح و جنگ کے تعلقات کی وضاحت بھی کرتا ہے غرض اسلامی فقہ طہارت کے مسائل و آداب سے لے کر کھانے پینے کے آداب، تشکیل حکومت اور جہاد تک مسلم فرد اور مسلم معاشرے کی زندگی سے متعلق تمام تفصیلات بیان کرتی ہے جبکہ دوسرے مذاہب کا دامن خالی نظر آتا ہے وہاں نہ عقیدہ کی تفصیلات میسر ہیں نہ عمل کی، نہ فرائض حکومت کو بیان کیا گیا ہے نہ حقوق رعایا کو اسی وجہ سے انہوں نے بندر بانٹ کے مثل یہ نعرہ لگایا ہے جو حصہ قیصر کا ہے قیصر کو دے دو جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دے دو جبکہ اسلام میں نہ ان نعروں کی گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت لادینی طرز فکر (سیکولرزم) امت کے مزاج سے دور اور

اس کے تصورات سے مختلف ہے یہ تصور اجنبی ہے اور باہر سے داخل کیا ہوا ہے اسی لیے یہ امت اسلامیہ کو اندر سے متحرک نہیں کر سکتا ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیا جس کے بارے میں عقل یہ کہے کہ اگر آپ صلی لی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نہ دیا ہوتا تو بہتر ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسی بات سے نہیں روکا جس کے بارے میں عقل یہ کہے کہ اگر اس سے نہ روکا ہوتا تو اچھا ہوتا۔

سیکولرزم سراسر ہماری اصلیت اور حاکمیت اعلیٰ کے خلاف ہے کیونکہ یہ تصور باہر سے درآمد کردہ ہے اس کی تاریخ اور اس کے وجود کے پس منظر کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں ہمارے شعائر ، ہمارے عقائد ہمارے قوانین اور ہمارے حالات اس سے بالکل مختلف ہیں۔

اہل مغرب نے سیکولرزم کا تصور اپنے مخصوص حالات کے تحت اختیار کیا اس وقت ان کے سامنے کلیسا کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ تھا جس کے لیے انہوں نے سیکولرزم اختیار کیا ہمارے یہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کے لیے سیکولرزم کو اختیار کیا جائے بلکہ سیکولرزم خود ایک مسئلہ ہے اگر اسے ہمارے یہاں اختیار کر لیا گیا تو اس سے بے شمار مسائل پیدا ہو جائیں گے جنہیں حل کرنا دشوار ہوگا سیکولرزم لادینیت چاہتی ہے کہ اگر اسلام موجود ہو تو کسی کونے میں پڑا رہے اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو یہ زندگی کے کسی خاموش گوشے میں پڑا رہنا بھی لادینیت اسلام پر اپنا احسان گردانتی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اسلام کو اس حد تک بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں لادینیت چاہتی ہے کہ اگر لوگ اسلام سے اپنا تعلق باقی ہی رکھنا چاہتے ہیں تو وہ بس اتنا ہو کہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر کبھی کبھار کوئی دینی گفتگو نشر ہو جائے جمعہ کے روز اخبار میں دینی صفحہ شامل ہو جائے عام نظام تعلیم میں ایک پیریڈ دینی تعلیم کا مقرر ہو جائے سرکاری قوانین کے مجموعہ میں ایک حصہ اسلام کے شخصی قوانین کا رکھ لیا جائے

معاشرے کے بے شمار اداروں میں ایک مسجد تعمیر کر دی جائے اور نظام حکومت میں ایک وزارت اوقاف بھی قائم ہو جائے لادینیت کے حامی کہتے ہیں کہ اسلام کو چاہیے کہ اسی پر اکتفا کرے اور لادینیت کا شکریہ بجا لائے کہ اس نے اسلام کو محراب و منبر سے اتنا سر اوپر اٹھا کر باہر جھانکنے کی اجازت دی مگر خود اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ زندگی کے صرف ایک گوشہ یا ایک پہلو پر قناعت نہیں کر سکتا یہ نہیں ہو سکتا کہ گھر سارا لادینیت کے حوالے ہو اور اس گھر میں اسلام کی حیثیت مہمان کی ہو یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام اور لادینیت میں تصادم شروع ہوتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں جاری رہتا ہے خصوصاً عقائد، عبادات، اخلاق اور قانون سازی کے شعبوں میں کیونکہ اسلام کے آنے کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ ان شعبوں کو صحیح خطوط پر استوار کیا جائے اور ان سے متعلق تمام ضروری احکام و ہدایات تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھ دی جائیں۔

سیکولرزم کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ مسلمان اسلام کو بطور عقیدہ مانتے ہیں اللہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور یوم آخرت پر ایمان رکھیں اس کی وجہ سیکولرزم کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے اور یہ آزادی ایسا حق ہے جسے دنیا کے تمام مواثیق اور جدید دساتیر میں تسلیم کیا گیا ہے مگر اسلام، دار الاسلام میں اس پر اکتفاء نہیں کر سکتا کہ اس کا عقیدہ کوئی ایسی شيء ہو جس کی محض اجازت ہو اور وہ ممنوعہ اشیاء نشہ آور چیزوں کی طرح ممنوع نہ ہو اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ اس کا عقیدہ زندگی کی روح اور وجود کا جوہر ہو معاشرے کے افراد کی راہنمائی کرنے والا ہو اور افراد امت کی نفسیاتی و فکری تکوین کی اساس ہو بالفاظ دیگر اسلام ہی تربیت و ثقافت کا محور، فن اور ابلاغ کا مرکز اور تمام معاشرے کی قانون سازی اور رسم و رواج کی بنیاد ہو اسے مادہ پرستی حیوان پرستی نیز جنوں انسانوں، درختوں، پتھروں

خواہشات نفس اور طاغوت کو معبود بنانے سے روکتا ہے مسلمان زندگی کا استقبال بھی توحید سے کرتا ہے اور زندگی کو الوداع بھی کلمہ توحید سے کرتا ہے اس استقبال اور الوداع کے درمیان وہ توحید کا پیغام دینے کے لیے زندہ رہتا ہے اس پر عمل کرتا ہے اور اسی کی طرف بلاتا ہے چنانچہ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے ایرانی لشکر کے سپہ سالار رستم سے کہا تھا۔

"اللہ نے ہمیں اس لیے اٹھایا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو
انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی میں لے آئیں"

کیا اسلامی معاشرہ میں اسلام کو صرف اتنا ہی مقام حاصل ہو کہ اس کا وجود برداشت کر لیا جائے یعنی اگر کوئی اس پر ایمان لے آئے تو اس میں کوئی حرج نہ ہو اور اگر کوئی اسے ترک کر دے تو اس میں بھی کوئی حرج نہ ہو ؟ کیونکہ لادینیت کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ دین اللہ کا ہے وطن سب کا ہے لادینیت دینی رابطے کو کوئی اہمیت نہیں دیتی بلکہ وہ اپنے تمام معاشرتی و سیاسی تعلقات خون، نسل، وطن، مٹی اور طرح کے دیگر مادی عناصر کی بنیاد پر استوار کرتی ہے اور یہ طرز فکر اسی سراسر اسلام کے خلاف ہے لادینیت یہ چاہتی ہے کہ اسلام ضمیر کی گہرائیوں میں چھپا رہے اور کارزار زندگی میں اس کا کوئی اثر نہ ہو اور نہ وہ زندگی کے مقاصد اور مناہج پر اثر انداز ہو اگر کہیں تھوڑا بہت اس کا اظہار ہو بھی تو وہ مسجد کی چار دیواری سے باہر نہ آنے پائے بلکہ مسجد بھی لادینیت ہی کے تسلط میں رہے اسی بناء پر وہ مسلمان جو لادینیت پر مبنی نظام میں زندگی گزارتے ہیں اپنے عقیدے اور عملی زندگی میں سخت تضاد محسوس کرتے ہیں عقیدہ انہیں مشرق کی طرف کھینچتا ہے اور عملی زندگی مغرب کی طرف عقیدہ جس شے کو حرام قرار دیتا ہے لادینیت اسے جائز سمجھتی ہے اور عقیدہ جس امر کو لازم قرار دیتا ہے لادینیت اسے فضول ٹھہراتی ہے اس سے واضح ہوا کہ اسلام اور لادینیت زندگی کے دو بالکل متضاد نظریے ہیں

یہ کبھی ایک دوسرے سے مل کر نہیں رہ سکتے ان دو سوکنوں کی طرح کہ اگر ایک کو ایک کو راضی کرو تو دوسری ناراض ہو جائے گی یا ترازو کے پلڑوں کی طرح کہ ایک جتنا جھکتا جائے گا دوسرا اتنا ہی اوپر اٹھتا جائے گا۔ لادینی نظام میں عبادات کے ادا کرنے یا انہیں ترک کر دینے سے کسی انسان کے مرتبہ اور تعظیم میں کوئی فرق نہیں پڑتا اخلاق کے بارے میں اسلام کے نقطہء نظر اور سیکولرزم کے مؤقف میں صریح اختلاف ہے مثلاً مرد و زن کے تعلقات کا دائرہ اسلام مرد و زن دونوں کو قانونی نکاح کے دائرے میں تعمیری رخ دیتا ہے اس متعین دائرے سے باہر پر جنسی تعلق و دواعي تعلق کو اسلام حرام قرار دیتا ہے جبکہ لادینیت کی نظر میں صنفین کے اختلاط میں نہ کوئی حرج ہے اور نہ کسی قسم کی پابندی ہے لادینیت قانون سازی کا مطلق حق اللہ سے چھین کر مخلوق کو دے دینا چاہتی ہے کہ اسے اختیار ہے وہ جیسے چاہے قانون بنائے یعنی لادینیت اس بات کی معترف ہے کہ کائنات کا خالق اللہ پاک ہے لیکن اس امر کا اعتراف نہیں کرتی کہ کائنات میں حکم بھی اسی کا نافذ ہے جبکہ اسلام کہتا ہے کہ خلق اور امر دونوں ہی اللہ پاک کے لیے ہیں دراصل لادینیت اللہ پاک کی شان الوہیت سے پوری طرح آشنا ہی نہیں وہ اس بات کو عقل سے دور سمجھتی ہے کہ تغیر زمان و مکان کے ساتھ انسان جن حالات و حوادث سے گزرتا ہے اللہ پاک ان سب سے واقف ہے اور اس نے ان تمام تغیرات کو سامنے رکھ کر ایسے احکام و اصول دیے ہیں جو ہر دور ہر زمانی بر مقام کے رہنے والوں کے لیے موزوں ہیں اور ان سے افراد ہوں یا معاشرہ سب کے مصالح کی تکمیل ہوتی ہے اگرچہ ان احکام و اصول کو چودہ سو برس گزر گئے ہوں جیسا کہ آج کل اکثر لوگ شریعت اسلامی کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں خصوصاً غیر مسلم معاشرہ کہ شریعت اسلامی بہت سخت ہے تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ کون نہیں جانتا کہ انسان کی زندگی کے تین دور ہیں ایک بچپن ایک شباب ایک پیری اور ہر

دور کا اقتضاء الگ ہے ہر دور کی ضروریات جدا گانہ ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ شیر خوار کے زمانے کی غذا صرف ماں کا دودھ ہوتا ہے جوں جوں سن و سال بڑھتے جاتے ہیں غذا بھی بدلتی جاتی ہے اور احکام بھی بدلتے جاتے ہیں حکومت کی طرف سے بچوں اور لڑکوں کے لیے قانون بہت کم اور مختصر ہوتے ہیں اصل قانون عاقل اور دانش مندوں کے لیے ہوتا ہے جوں جوں عقل و شعور بڑھتا جاتا ہے اسی قدر احکام اور پابندیاں بڑھتی جاتی ہیں اسی طرح نوع انسانی جب شیر خوارگی کازمانہ گزار رہی تھی تو اس کی روحانی غذا (شریعت) بھی مختصر تھی جوں جوں نوع انسانی ترقی کرتی رہی اور اس کا عقل و شعور بڑھتا رہا تو اس کی روحانی غذا احکام و شریعت بھی اس سے بڑھ کر آتی رہی جب نوع انسانی اپنے ادراک و شعور کے اوج پر پہنچ گئی اور اس قابل ہو گئی کہ دقیق سے دقیق مسائل سمجھ سکے تو اس کے لیے ایک کامل و مکمل شریعت اتاری گئی جو ہر قسم کے آئین و قانون پر مشتمل ہے اور ایسے صحیح اور محکم اصول کی جامع ہے کہ جن میں ذرا برابر اختلال اور اضمحلال کا امکان نہیں اور نہ اس شریعت کے بعد کسی شریعت کی ضرورت ہے لادینیت اس وضعی قانون کو تو تسلیم کرتی ہے جس کا نہ ہماری سرزمین سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہماری تاریخ میں اس کی کوئی بنیاد کہیں موجود ہے اور نہ اسے قبول عام حاصل ہے لیکن اس شریعت کو رد کرتی ہے جس کو امت کی غالب اکثریت بطور عقیدہ مانتی ہے کہ من جانب اللہ اور عدل و انصاف پر مبنی ہے اور کمال و دوام کے اوصاف سے متصف ہے افراد امت اگر اس کی خلاف ورزی کریں تو وہ اپنے آپ کو گناہگار محسوس کرتے ہیں اور اپنے آپ کو دنیا و آخرت میں اللہ کے عذاب کی وعید کا مخاطب سمجھتے ہیں لادینیت کے حامی ہمیں ماضی کی تاریخ سے ڈراتے ہیں جس کا ہماری سرزمین سے کوئی تعلق نہیں یہ لوگ ہمیں ان عفریتوں سے ڈراتے ہیں جو ہمارے گھروں میں کبھی داخل ہی نہیں ہوئے ان کی طرف سے ہمیں ایسے اوہام میں مبتلا

کرنے کی سعی کی جا رہی ہے جن کا ہمارے ماضی، ہمارے افکار اور ہمارے دین سے کوئی تعلق نہیں اس دور کا سب سے عظیم فتنہ قطعی امور کو ظنی بنا دینا اور جن امور پر اتفاق ہے ان کو بھی محل اختلاف بنا دینا ہے یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے کہ ہم غفلت میں ان لوگوں کی باتیں مانتے چلے جائیں جو ضروریات دین اور اصولوں تک کو بحث و نزاع کا موضوع بنا کر دین کی بنیادوں ہی کو منہدم کر دینا چاہتے ہیں ملحدین کی طرف سے عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ انسان کا جوہر تغییر ہے لہذا اس کے لیے ایسی شریعت موزوں نہیں ہو سکتی جس کا جوہر اثبات ہو جواب یہ کہنا کہ انسان کا جوہر تغییر ہے صحیح نہیں یہ لوگ آج کے انسان کو دیکھتے ہیں جس نے فاصلے مٹا دیئے آواز کو فیتوں وغیرہ میں بند کر دیا ایتم پھاڑ دیا چاند پر کمند ڈال دی دل کی اور آنکھ کی پیوند کاری کر دی حیاتیات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور الیکٹرونی عقل (کمپیوٹر) ایجاد کر لیا اس انسان کا موازنہ لوگ اس انسان سے کرتے ہیں جو اپنی دو ٹانگوں پر چلتا تھا یا کسی سواری کے جانور پر سوار ہو کر سفر کرتا تھا یا کشتی میں بیٹھ کر پانی کے دوش پر ہوا کی مدد سے تیرتا تھا اور جڑی بوٹیوں سے اپنا علاج . کرتا تھا ا یا یہ لوگ کل . کے انسان اور آج کے انسان کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ انسان میں کس قدر عظیم تغیر واقع ہو گیا لیکن انسان کی دنیا میں اس تغیر کے واقع ہونے کے باوجود کیا انسان کی ماہیت تبدیل ہو گئی؟ کیا اس کی حقیقت متغیر ہو گئی؟ سوال کا تعلق انسان کے جوہر سے ہے اس کے لباس، غذا، سکونت، سواری اور اس کے زیر استعمال اشیاء سے نہیں اور اس امر سے بھی نہیں کہ انسان نے اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی کائنات کی نسبت کس قدر علم حاصل کر لیا ہے اور کائنات کی قوتوں سے استفادے کی استطاعت کس حد تک حاصل کر لی ہے بلاشبہ انسان کی خوردونوش کی اشیاء اس کے لباس اور بودو باش، اس کے ذرائع سفر، آلات اور ہتھیاروں میں عظیم تغیر واقع ہوا ہے بلاشبہ انسان کی طبیعت کی معرفت

اور اس کی تسخیر کے وسائل میں عظیم انقلاب آ گیا ہے مگر اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ انسان کے جوہر اور اس کی ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی انسان از آدم تا این آدم انسان ہی ہے نہ اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی آئی اور نہ اس کی اصلی جبلتوں میں کوئی تغیر واقع ہوا اور نہ اس کی وہ بنیادی ضروریات ختم ہوئیں جن کی تکمیل جنت میں بھی ہو رہی تھی اور جنت سے اترنے کے بعد بھی انسان جن کی تکمیل کے لیے دن رات تگ و دو میں لگا ہوا ہے انسان خواہ بیسویں صدی کا ہو یا اکیسویں صدی کا اس کو عقیدہ اور ایمان کی ہمیشہ ضرورت رہے گی انسان ہمیشہ اللہ پاک کی بندگی اور عبادت کا محتاج رہے گا انسان کو ہمیشہ اخلاق و فضائل کی احتیاج رہے گی انسان کو ہمیشہ اس امر کی ضرورت رہے گی کہ جب وہ اللہ پاک کی حدود سے تجاوز کرے یا انسانوں کے حقوق پامال کرے تو اس پر اسے سرزنش کی جائے انسان کا چاند و مریخ پر پہنچ جانا یا فضاء و سمندر کو مسخر کر لینا یہ جواز فراہم نہیں کرتا کہ اب وہ اللہ پاک کی بندگی کا محتاج نہیں یا اسے اخلاق و اعمال کی ضرورت نہیں یا اسے حدود و حقوق کو پامال کرنے پر سزا نہ دی جائے بلکہ انسانی عقل کی یہ ترقی تو و اس بات کی مؤید ہے کہ اب وہ پہلے سے زیادہ بندگی کا محتاج ہے اور سزا کا پہلے سے زیادہ مستحق ہے،، اگر اسلامی شریعت ثبات اور تغیر یا لچک کے ہر دو اصولوں پر مشتمل ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ انسانی زندگی کی طبیعت میں بھی بعض عناصر ثابت اور غیر متغیر ہیں حتیٰ کہ اگر ہم اپنے گردوپیش میں موجود کائنات پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ بہت سی چیزیں ثابت ہیں جن پر ہزارہا سال گزر گئے مگر وہ اسی طرح ہیں مثلاً زمین آسمان پہاڑ، سمندر ،دن رات، شمس قمر و غیرہ تو معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت انسانی فطرت نیز کائنات کی فطرت سے ہم آہنگ ہے یہی وہ خوبی ہے جس کی بناء پر معاشرہ تحلیل ہونے ، ختم

ہو جائے اور دوسرے معاشروں میں گھل مل جانے سے محفوظ رہتا ہے اور اسلامی معاشرہ اپنے بنیادی اصولوں، اقدار اور مقاصد کے لحاظ سے ثابت و برقرار رہتا ہے۔

سیکولرز کا ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ نفاذ شریعت کا عملی دور فقط خلفاء راشدین کا دور ہے اور بقول ان کے کہ داعیان شریعت و حامیان شریعت کے پاس بھی بطور مثال صرف انہی کا دور ہے خصوصاً عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا اگر صدیوں کے تجربات اور واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مماثل حکمران کا آنا ممکن نہیں تو یہ اپنے متبعین کو ایسے امر کی کیوں امید دلا رہے ہیں جس کا وقوع پذیر ہونا ممکن نہیں ہے جواب ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ نفاذ شریعت کا عملی دور ہونا فقط خلفاء راشدین کا دور تھا ان کے بعد بھی بہت ساری مثالیں موجود ہیں جس میں نفاذ شریعت عملاً ہوئی مثلاً حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ، یزید بن ولید رحمۃ اللہ شہید نورالدین محمود رحمۃ اللہ، سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ وغیرہ

جواب: یہ بھی تاریخی حقائق سے نا انصافی ہے تمام خلفاء بنو امیہ، خلفاء بنو عباس آل عثمان مصر و شام کے سلاطین شاہان مغلیہ سب کو ہم ظالم، فاجر، اسلامی عدل و اسلامی نظام سے منحرف قرار دیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں بہت سے عادل و منصف گزرے ہیں اور ایسے تو بہت سے ہی گزرے ہیں کہ ان کی خوبیاں ان کی خامیوں پر غالب تھیں ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ مستشرقین ملحدین رائی کا پربت اور چیونٹی کا ہاتھی بنانے میں ماہر ہوتے ہیں اصل میں تو یہ گندگی پر بیٹھنے والی وہ مکھیاں ہیں جنہیں صرف گندگی ہی نظر آتی ہے اور یہ بالخصوص اموی دور کو اپنے نشانے پر رکھتے ہیں ہم کہتے ہیں کہ اگر اموی دور میں اسلامی معاشرہ اتنا برا ہوتا جتنا یہ کہتے ہیں تو اس دور میں اسلام کی روشنی مغرب میں اندلس تک مشرق میں چین تک اور ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے دور دراز علاقوں تک پھیلنا ممکن نہ ہوتی۔

جواب: اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ شریعت اسلامیہ خلفاء راشدین کے بعد نافذ نہیں رہی تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ دین پچھلی چودہ صدیوں میں کبھی نافذ نہیں رہا اور نہ ہی اس دوران اسلامی حکومت رہی یہ نہ تاریخی لحاظ سے صحیح ہے نہ منطقی اعتبار سے قابل قبول ہے۔

سوال سیکولرزم کے حامیوں کہتے ہیں کہ کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں سوڈان کا اسلام ایران کا اسلام پاکستان کا اسلام یا سعودی عرب کا اسلام بعض اوقات یہ لوگ اسلام کو ان ممالک کے سربراہوں سے منسوب کر دینے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے چنانچہ کہتے ہیں کہ نمیری کا اسلام خمینی کا اسلام ملا عمر کا اسلام یا پھر ضیاء الحق کا اسلام اور کبھی کہتے ہیں کہ علماء دین کا اسلام، افواج کا اسلام یا بادشاہوں کا اسلام

جواب۔ مختلف علاقوں اور ممالک میں فہم اسلام کا جو فرق ہے وہ ان کی نظر میں ایک اسلام سے متعلق متعدد نقطہ ہائے نظر کا اختلاف نہیں بلکہ اس طرح ان کی رائے میں ایک اسلام کی بجائے متعدد اسلام بن گئے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ سنی اسلام شیعہ اسلام وہابی اسلام متجدد اسلام اور تقلیدی اسلام و غیرہ۔

جواب: ان ممالک کے اندر نفاذ اسلام کے تجربات میں جو انحرافات ظاہر ہوئے ہیں انہیں لادینیت کے حامیوں نے اسلام کی غلطی اور اس کا انحراف قرار دے دیا گویا اسلام کی عملی تطبیق میں کوئی غلطی ہو جانا خود اسلام کی غلطی ہے اور اسلام کے فہم میں غلطی یا انحراف کا جواب دہ بھی اسلام خود ہے ہم ان امور کا جواب دو طرح سے دیں گے عجیب بات ہے کہ جو لوگ اسلامی تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے اختلافات کو بڑھا چڑھا کر اور ہر چھوٹی بڑی جماعت کو امت مسلمہ میں شمار کر کے اسلام کی اس خصوصیت کو کم کرنا چاہتے ہیں وہ اس ژولیدگی اور

اختلاف کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو جدید معاصر تحریکات اور ان کے افکار و نظریات میں پایا جاتا ہے اور جن کے آج بت تراش لیے گئے ہیں اور مؤلفین و مصنفین ان بتوں کے مجاور بنے بیٹھے ہیں ہم اسلام کی دعوت کسی ملک یا کسی شخصیت کے ساتھ منسوب کر کے نہیں دیتے 2. بلکہ ہماری اسلام کی دعوت مطلق اسلام کی دعوت ہے یعنی وہ اسلام جو قرآن و سنت کا اسلام ہے وہ اسلام جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین رحمہم اللہ اجمعین کا اسلام ہے جس کے اصول و مصادر واضح اور متعین ہیں ہم نے اسلام کے مفہوم کے بیان میں اس کے اساسی خطوط بیان کر دیئے ہیں جہاں تک تنفیذ میں غلطی اور انحراف کا تعلق ہے تو اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہوں گے جو اس عمل میں شریک ہوں گے اسلام اس غلطی اور انحراف سے بری ہو گا غرض ان تجربات میں ہر تجربہ کی خطاء سے اسلام بری بری ہے اور جو ان تجربات میں اجتہادی غلطیاں واقع ہوئی ہیں تو اجتہادی غلطی سے درگزر کرن رنے کے لیے اسلام نے بڑا توسع اختیار کیا ہے در حقیقت اسلام اس قدر عظیم ہے کہ اسے کسی کی غلطی اور انحراف سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا

لادینیت کے حامی جب اسلام کی ان نمایاں اور بے مثال شخصیات کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے امت کی بہترین قیادت اور عدالت و استقامت کی عظیم مثالیں پیش کیں تو وہ ان کے فضائل کو اسلام کی جانب منسوب نہیں کرتے جس کی گود میں انہوں نے پرورش پائی جس کے مدرسے میں انہوں نے تعلیم حاصل کی اور جس کے سرچشمے سے وہ سیراب ہوئے اور جس کی ہدایت کے سبب انہیں یہ تمام فوائد و کمالات حاصل ہوئے چنانچہ یہ لوگ جب بطور مثال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی ذاتی خوبیوں کا انتساب ان کی ذات اور ان کی عبقری شخصیت کی طرف کرتے ہیں اور اسلام کے پیدہ کردہ فضائل جیسے تقوی ، عدل، استقامت اور

حسن اجتہاد کا ذکر بھی نہیں کرتے وہ تاریخ اسلام میں عدل و انصاف اخوۃ، انسانیت کی خیر خواہی اور ایثار و قربانی کی بے شمار روشن اور لازوال مثالوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں کہتے کہ یہ اسلام ہے لیکن جہاں انہیں ظلم انحراف، کمزوری اور فسق نظر آتا ہے وہاں وہ فورا پکار اٹھتے ہیں کہ ،، یہ اسلام ہے،، گویا ان لوگوں کی وجہ سے تو اسلام کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے جو اس سے منحرف ہو گئے لیکن جنھوں نے اس پر استقامت اختیار کی اور ہر طرح کے حالات میں بے مثال کردار کا مظاہرہ کیا تو ان کے ان بے مثال کارناموں کی وجہ سے اسلام کی کوئی تعریف و توصیف نہیں کی جاتی بلکہ اسے ان افراد کی ذاتی صلاحیت و عبقریت کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے اس منطق پر چلتے ہوئے نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ زانی قاتل اور مے نوش حکمران کو تو اسلام کا نمونہ قرار دیا جائے لیکن وہ حاکم جو عادل ہو، اعلیٰ سیرت و کردار کا حامل ہو، اور جو زانی، شرابی پر حد قائم کرے اس کی ان خوبیوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ تمام خصائص اس کے ذاتی اوصاف ہیں اس سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح اسلام کے خلاف جو دلیل دی جاتی ہے اس کو اور اس کے متناقض دلیل دونوں کو اسلام کی مخالفت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے ۔

اصل میں لادینیت کے حامی کا یہ مقصد ہے کہ اسلام کسی خطے میں قانونی حیثیت سے نافذ نہ ہو ان کو ڈر اس بات سے ہے کہ اگر اسلام کہیں نافذ ہو گیا تو ہماری دو سو سالہ محنت پر پانی پھر جائے گا اسی وجہ سے وہ یہ راگ الاپتے رہتے ہیں کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس لادینیت نے دنیا کو تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں دیا ہے کتنی تعجب خیز بات ہے کہ جو ہندو چوہوں اور حشرات کے مارنے سے احتراز کرتے ہیں اور ان کے یہاں بڑے بڑے ہوٹلوں میں مچھر یا مکھی مار محلول استعمال نہیں کیے جاتے کہ

مچھر اور مکھی بھی ذی روح ہے لیکن یہی ہندو ہیں جو ہزاروں مسلمانوں کا اس طرح خون بہاتے ہیں جیسے وہ ذی روح نہ ہوں لبنان میں مجنونانہ فرقہ وارانہ جنگ دس سال سے زائد عرصے سے جاری ہے خون بہہ رہا ہے گھر اجڑ رہے ہیں اور تباہی پھیل رہی ہے ، صبرا اور شتیلا میں جو کچھ ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہے کہ ان کی بھوک سے تنگی اس حالت کو پہنچ چکی ہے کہ سوال پیدا ہوا کہ آیا مردار کھانا ان کے لیے جائز ہو گیا ہے یہ ایک خونی فرقہ وارانہ جنگ ہے جس کے شعلے دم بدم بھڑکتے جا رہے ہیں اس کی تیزی اور تندی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ایسی ہلاکت خیزی مچی ہوئی ہے جس کے ذکر سے بھی تاریخ انسانیت کانپ اٹھتی ہے کیا لادینیت نے اس کا کوئی حل تلاش کیا ہے افسوس کوئی نہیں اور جو لوگ لادینیت کے حامی ہیں ان سے سوال ہے ہے : کہ کیا لادینیت کا مؤقف اختیار اور اس کے نتیجے میں جو کرنے سے تل زعتر کا معرکہ و واقع ہونے سے رک گے جانوں کا اتلاف ہونا تھا اور مصائب کے پہاڑ ٹوٹنے تھے وہ ٹل گئے؟ کیا ایلول کا سیاہ قتل عام نہیں ہوا؟ کیا لبنان پر فوج کشی نہیں ہوئی؟ کیا ا بیروت کا محاصرہ نہیں ہوا؟ اور وہاں سے فلسطینیوں کو نہیں نکالا گیا؟ کیا صبرا اور شتیلا میں خون بہنا بند ہو گیا اور لبنان کی خیمہ بستیاں اجڑنے سے رک گئیں؟ قسم بخدا اس لادینی مؤقف نے ذرہ بھر فائدہ نہیں پہنچایا اور نہ اس کے مؤقف کو خود امریکیوں اور یہودیوں نے قبول کیا بجائے اس کے کہ یہ لوگ لادینی مؤقف کو دلیل بناتے جس سے کوئی اثر ہی مرتب نہیں ہوا کتنا اچھا ہوتا اگر وہ اسرائیل کے مذہبی مؤقف کو دلیل بناتے کیونکہ اسرائیل کے دینی مؤقف ہی نے یہودیوں کو صدیوں کے جمود سے نکال کر ان کی مختلف ٹکڑیوں کو ایک امت بنا دیا اور ہزاروں برس کی ذلت و مسکنت کے مارے ہوؤں میں زندگی کی روح پھونک دی انہوں نے اپنی اس مردہ زبان کو بھی زندہ کر لیا جو دنیا کی کسی چھوٹی سے چھوٹی ریاست کی بھی زبان نہ تھی انہوں نے اپنے لیے ایسی حکومت

بھی قائم کر لی کہ دنیا بھر کے یہودی اس کے مذہبی انتساب پر فخر محسوس کرتے ہیں انہوں نے اپنی اس مملکت کا نام اپنے ایک پیغمبر کے نام پر رکھا اور تورات تلمود کی تعلیمات کی روشنی میں اس کے استحکام اور ترقی کے لیے کوششیں کر رہے ہیں اسرائیل کی مملکت ہماری سرزمین غصب کر کے ہمارے کھنڈرات پر اور ہمارے باشندوں کو باہر نکال کر ہماری لاشوں پر قائم کی گئی ہے ہم سارے موجود تھے ہم سنتے بھی رہے اور دیکھتے بھی رہے بیس (20) عرب ریاستیں اور چالیس (40) سے زائد اسلامی ممالک!! لیکن ہمارا لادینی مؤقف ان کے دینی مؤقف سے شکست کھا گیا ان کے دینی مؤقف کے سامنے ہمارا لادینی مؤقف ریت کی دیوار ثابت ہوا ہماری ان کے ساتھ جنگیں ہوئیں جن میں ان کے پاس یہودیت تھی اور ہم اسلام سے خالی تھے ان کے پاس تورات تھی اور ہمارے پاس قرآن نہ تھا ان کے پاس حضرت موسی علیہ السلام کی تعلیمات تھیں اور ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے عاری تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے حصہ میں شکست ہزیمت اور ذلت آئی جو ایک ایک گھونٹ حلق سے اتارتے رہے سچ ہے چمن کے تخت پر جس دم شہہ گل کا تجمل تھا۔ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں ایک شور تھا غل تھا۔جب آئے دن خزاں کے کچھ نہ تھا بجز خار گلشن میں۔بتاتا تھا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا۔کے چولے کو اب اتار دو یہ آپ کے جسم پر بھدا لگتا ہے اور ادھر ادھر کی ٹامک ٹونیاں مارنا ختم کر دو نہ اپنی عاقبت خراب کرو نہ دوسروں کی جنہیں تعمیر گلشن میں لہو دینا نہیں پڑتا۔وہ اکثر قوم کی آزادیوں کو بیچ دیتے ہیں روئیے تو کس کو روئیے کہ چمن کے اجڑنے میں خزاں کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا خود باغبانوں نے کرم فرمائی ہے آج پیارے فلسطین کی حالت پر تو کچھ لکھتے ہوئے بھی ہاتھ کانپ اٹھتے ہیں ہم سیکولرز اور ان کے حامیوں کو درد دل سے کہتے ہیں آئے دنیا کے دانش مندو اور ہوش مندو! اسلام کی آغوش میں آجاؤ تم کو ایسے اصول اور عقائد کی تعلیم ملے گی جو عین عقل

سلیم اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہوں گے ایسے مکارم اخلاق کی تلقین ہو گی کہ حیاء و شرمساری عفت میں اس کا جواب نہ ہو گا اور ہم لادینیت کے حامیوں کو خیر خواہی کے جذبے سے کہتے ہیں کہ اس لادینیت سلجھاتے ہو بے کار یہ پیچیدہ لکیریں۔یہ نقش غلط ہے تو مٹا کیوں نہیں دیتے۔

قیام اسرائیل کی کہانی

جب یہودی خلافت عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانی کے پاس آئے سلطان عبد الحمید ثانی نے اپنی یاد داشتوں میں لکھا ہے کہ یہود کی عالمی تنظیم کا وفد ان کے پاس آیا اور ان سے درخواست کی کہ انہیں فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے چونکہ عثمانی سلطنت کے قانون کے مطابق یہودیوں کو فلسطین میں آنے کی کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دیں سلطان مرحوم نے اس پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا اور وفد کو ملاقات کے کمرے سے فوراً نکل جانے کی ہدایت کی نیز اپنے عملہ سے کہا کہ آئندہ اس وفد کو دوبارہ ان سے ملاقات کا وقت نہ دیا جائے اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ یہودیوں کے فساد عظیم کی نشاندھی کرتا ہے ان کے اور بیت المقدس کی زیارت کی اجازت تو تھی مگر وہاں زمین خریدنے اور آباد ہوئے کی اجازت نہیں تھی بیسویں صدی کے آغاز تک پورے فلسطین میں یہودیوں کی کوئی بستی نہیں تھی یہ مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے تھے سلطان عبد الحمید نے یہ درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیا اس کے بعد دوسری بار یہودی لیڈروں کا وفد ان سے ملا تو یہ پیشکش کی کہ ہم سلطنت عثمانیہ کے لیے ایک بڑی یونیورسٹی بنانے کے لیے تیار اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کے لیے یہودی سلطنت عثمانیہ کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہیں اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کے لیے یہودی ہیں سلطنت عثمانیہ کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہیں اس کے لیے انہیں جگہ فراہم کی جائے سلطان عبد الحمید

نے وفد کو جواب دیا کہ وہ یونیورسٹی کے لیے جگہ فراہم کرنے اور ہر ممکن سہولیات دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ یہ یونیورسٹی فلسطین کی بجائے کسی اور علاقے میں قائم کی جائے یونیورسٹی کے نام پر وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دیں گے لیکن وفد نے یہ بات قبول نہ کی سلطان عبد الحمید مرحوم نے لکھا ہے کہ تیسری بار پھر یہودی لیڈروں کا وفد ان سے ملا اور یہ پیشکش کی کہ وہ جتنی رقم چاہیں انہیں دے دی جائے گی مگر وہ صرف یہودیوں کی ایک محدود تعداد خلاف عوام کو بھڑکا کر ان کی حکومت کو ختم کر دیا گیا حکومت کے خاتمہ کے بعد انہوں نے بقیہ زندگی نظر بندی کی حالت میں بسر کی اور اسی دوران مذکورہ یاد داشتیں تحریر کیں انہوں نے لکھا ہے کہ انہیں خلافت سے برطرفی کا پروانہ دینے کے لیے جو وفد آیا اس میں ترکی پارلیمنٹ کا ممبر قرہ صو بھی شامل تھا جو اس سے قبل مذکورہ یہودی وفد میں بھی شریک تھا اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ سلطان مرحوم کے خلاف سیاسی تحریک اور ان کی برطرفی کی یہ ساری کارروائی یہودی سازشوں کا شاخسانہ تھی

اس دوران فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کر کے اپنا گورنر بٹھا دیا جس نے یہودیوں کو اجازت دی کہ وہ فلسطین میں آ کر جگہ خرید سکتے ہیں چنانچہ دنیا کے مختلف ممالک سے یہودیوں نے فلسطین میں آ کر آباد ہونا شروع کیا بلکہ معاہدہ بالفور کے ذریعے برطانیہ نے انہیں فلسطین میں اپنے لیے وطن بنانے کی اجازت دی جہاں 1948 میں ان کی تعداد ساڑھے چھ لاکھ تک پہنچ گئی اور انہوں نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا۔

سلطان عبد الحمید مرحوم کا خط

خلافت عثمانیہ کے آخری فرمانروا سلطان عبد الحمید مرحوم کا معزولی کے بعد اپنے روحانی پیشوا الشیخ محمود آفندی ابو الشامات کے نام تاریخی خط یا ھو بسم اللہ الرحمن الرحیم وبہ نستعین حمد اس خدا کی جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے اور افضل ترین درود اکمل ترین سلام نازل ہو ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو رب العالمین کے رسول ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آل و اصحاب اور متبعین پر قیامت تک درود و سلام نازل ہو میں اپنا یہ عریضہ سلسلہ شاذلیہ کے شیخ روح و حیات کو فیضان پہونچانے والے شیخ وقت شیخ محمود آفندی ابو الشامات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور دعوات صالحہ کا امیدوار ہو کر ان کے مبارک ہاتھوں کا بوسہ لیتا ہوں آداب و احترام کے بعد عرض کرتا ہوں کہ آپ کا سال رواں کے 22 مئی کا تحریر کردہ گرامی نامہ موصول ہوا میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ جناب والا برابر صحت و سلامتی کے ساتھ ہیں میرے آقا میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے سلسلہ شاذلیہ کے اوراد و وظائف شب و روز پابندی سے پڑھ رہا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ دائمی طور پر آپ کی دلی دعاؤں کا محتاج ہوں اس تمہید کے بعد میں آپ کی خدمت میں اور آپ جیسے دوسرے عقل سلیم رکھنے والوں کی خدمت میں ایک اہم مسئلہ پیش کرتا ہوں تاکہ یہ امانت تاریخ کی حفاظت میں آ جائے میں خلافت عثمانیہ سے صرف اس لیے الگ ہوا ہوں کہ مجھے جمیعت اتحاد و ترقی کی طرف سے بہت تنگ کیا گیا دھمکیاں دی گئیں اور خلافت ترک کرنے پر بالکل مجبور کر دیا گیا سبب یہ ہوا کہ ان اتحادیوں نے مجھ سے بار بار اصرار کیا کہ ارض مقدس فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کی تاسیس پر اتفاق کروں ان کے پیہم اصرار کے باوجود یہ بوجھ اٹھانے پر راضی نہ ہوا اخیر میں ان لوگوں نے پندرہ کروڑ برطانوی لیرہ سونا دینے کا وعدہ کیا میں نے قطعی طور پر اس تجویز کو ٹھکرا دیا اور انہیں

مندرجہ ذیل دو ٹوک جواب دیا،، اگر تم لوگ پندرہ کروڑ لیرہ سونے کی بجائے دنیا بھر کا سونا دو تب بھی اس بوجھ کو نہیں اٹھاؤں گا میں نے ملت اسلامیہ امت محمدیہ کی تیس سال سے زائد خدمت کی اب میں اپنے آباء و اجداد اور خلفاء و سلاطین کی تاریخ کو سیاہ نہیں کروں گا میں یہ بوجھ قطعی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔

میرے قطعی جواب کے بعد ان لوگوں نے مجھے معزول کرنے پر اتفاق کر لیا اور یہ پیغام پہونچایا کہ وہ مجھے شہر بدر کر کے سالونیکا بھیج دیں گے میں نے یہ تکلیف گوارہ کر لی میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں کہ میں نے ارض مقدس فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کو تسلیم کر کے دولت عثمانیہ اور عالم اسلام کو اس عیب و عار سے داغ دار کرنا قبول نہیں کیا اس لیے میں مکرر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرتا ہوں میرا خیال ہے کہ میں نے جو باتیں پیش کر دی ہیں وہ اس موضوع کے بارے میں کافی ہیں اپنے اس اہم خط کو ختم کرتا ہوں میں آپ کے مبارک ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ آداب قبول فرمائیں اور تمام بھائیوں دوستوں کو سلام کہیں میرے بزرگ استاد!! خط طویل ہو گیا لیکن آپ کو اور آپ کی حمایت کو مطلع کرنے کے لیے میں اس طوالت پر مجبور تھا۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ
خادم المسلمین عبد الحمید بن عبد المجید
221929 ستمبر

سیکولرزم کے اہداف

1. مسلمانوں کے عقائد میں شکوک و شبہات پیدا کرنا
.2 ملحدانہ افکار اور مادیت پرستانہ خیالات کو رواج دینا
3 سیکولر حکومتیں تشکیل دینا

حربے

1. جاہلی عصبیت کو فروغ دینا
2. مسلمانوں کو صالح قیادت سے متنفر کرن
3. آزادی نسوار

کمیونزم کا خطرہ اور نو آبادیاتی نظام

کمیونزم کے بارے میں غور کرتے وقت ہم یہ حقیقت اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کمیونزم کے خطرہ کی حیثیت خارجی کم اور داخلی زیادہ ہے اور اگرچہ خارجی عوامل اس فتنہ کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن فتنہ کا اصل منبع کمیونزم کا شکار ہونے والے معاشرے کی داخلی صورت حال ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں اس فتنہ کو خارجی سمجھ کر اس کی داخلی حیثیت سے چشم پوشی کی گئی وہاں کمیونزم کا اثر و نفوذ بڑھتا چلا گیا اور یورپی ممالک کی طرح جس معاشرہ میں کمیونزم کے داخلی سرچشمہ کو بند کرنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی وہاں کمیونزم کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا آج مسلم ممالک کمیونزم کی جارحانہ یلغار کی زد میں ہیں اور مسلم حکومتیں، ادارے اور مسلمانوں کی نظریاتی تحریکیں کمیونزم کی مسلح پیش رفت سے پیدا شدہ صورت حال کا جائزہ لے رہی ہیں اگر آج بھی کمیونزم کے داخلی محرکات و اسباب کو دور کرنے کی بجائے صرف خارجی یلغار سے محاذ آرائی کو ہی کافی سمجھ لیا گیا تو یہ حکمت عملی کمیونزم کی راہ

روکنے کی بجائے اس کی منزل کو اور قریب لانے کا باعث بنے گی اس لیے ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہیے کمیونزم کے جراثیم ہمیشہ معاشرہ میں مختلف طبقات کے درمیان معیار زندگی کے ہوشربا تفاوت سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام کے تحت گنے چنے افراد پر مشتمل طبقے کی طرف سے آبادی کی اکثریت کے استحصال کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں اور معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کمیونزم کے جراثیم کے لیے پیدائش اور افزائش کا باعث بنتی ہیں یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم نہ صرف اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں سمیت موجود ہے بلکہ کمیونزم کے خطرہ کو قریب لانے کا سب سے بڑا داخلی محرک یہی ہے مسلم معاشرہ کمیونزم کی یلغار کا براہ راست ہدف ہے اور یہاں معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کی فتنہ خیزیوں کا جائزہ لینے کے لیے زیادہ تفصیلات کو کریدنے کی بجائے پاکستان میں ایک طرف ڈیفنس کالونی، شادمان کالونی گلبرگ کے معیار زندگی کو دیکھ لیں اور دوسری طرف کچی آبادیوں میں قیام پذیر لوگوں کے معیار زندگی پر ایک نظر ڈال لیں اگر آپ ان دونوں کے درمیان فاصلہ ماپنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس تفاوت سے پیدا شدہ غلاظت کے ڈھیر پر پلنے والے کمیونزم کے وہ جراثیم بھی نظر آ جائیں گے جنہیں کرم کش ادویات کے ذریعے ہلاک کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام ہو چکی ہیں اور اب اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا کہ ایک ہی معاشرہ کے مختلف طبقوں کے درمیان معیار زندگی کے ہوشربا تفاوت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غلاظت کے ڈھیر کو بلا تاخیر اٹھا دیا جائے تاکہ کمیونزم کے جراثیم پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لینے سے پہلے ہی اپنی پناہ گاہ اور کمین گاہ سے محروم ہو جائیں ہمارا موجودہ معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ نوآبادیاتی دور کی یاد گار ہے جس کا اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں مگر بد قسمتی سے اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اس نوآبادیاتی نظام کے خلاف کمیونزم کی جنگ میں اسلام کے نام پر کام کرنے

والی تحریکوں نے توازن اور حکمت عملی کا دامن چھوڑ دیا ہے اسلامی نظام عدل جہاں کمیونزم کو ایک لمحہ کے لئے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے وہاں وہ موجودہ معاشی و معاشرتی ڈھانچہ کی موافقت بھی نہیں کرتا اس صورت حال میں حکمت عملی کا تقاضا تو یہ تھا کہ موجودہ نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدو جہد میں اسلام اور کمیونزم کے درمیان مسابقت کی فضاء پیدا کر دی جاتی اور اسلامی عناصر جو یہاں کمیونسٹ عناصر سے کہیں زیادہ مؤثر، طاقتور اور مستحکم ہیں اسی مسابقت کے ساتھ آنے والے انقلاب کی زمام کار کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے جیسا کہ پڑوسی ملک میں ہوا ہے لیکن یہاں بد قسمتی سے نہ صرف یہ کہ اسلام کو نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدو جہد کا سالار بنانے کی بجائے اس نظام کے حمایتی اور پناہ گاہ کے طور پر پیش کیا گیا بلکہ نو آبادیاتی نظام کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز پر سوشلست،، اور کمیونسٹ کی پھبتی کس کر کمیونزم کے دائرہ کو وسیع کرنے اور نو آبادیاتی نظام کے مخالفین کو کمیونسٹ کیمپ میں زبردستی دھکیلنے کی ناعاقبت اندیشانہ مساعی روا رکھی گئیں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلم عوام کی عظیم قربانیوں کے بعد جب جب اسلامی قوانین کے جس عمل کا آغاز ہوا اسے مصلحتوں، گروہی نزاکتوں اور بے تدبیری کے شکنجے میں اس بری طرح جکڑ دیا گیا کہ اسلامی نظام کے نفاذ سے وابستہ خوش فہمیوں اور آرزوؤں. کا محل شگاف آشنا ہو . چکا ہے آج صورتحال یہ ہے کہ اسلام اور نظریہ اسلام کی بات کرنے والے لوگوں کے چہرے معذرت و خجالت کی جھریوں سے سجے ہوئے ہیں جبکہ لادینیت اور انارکی کے علم بردار اپنے چہروں سے جھجک کے نقاب اتار کر دور پھینک چکے ہیں اسلام اور اسلامی نظام کے بارے میں عوامی اعتماد سے بہرہ ور طبقہ صرف علماء کا طبقہ تھا اور کسی حد تک آج بھی ہے لیکن علماء کرام نے فرقہ بندی کے عنوان سے قوم کو وہ تگنی کا ناچ نچایا ہے کہ لادینیت کے پرچارک

آج زیر لب یہ گنگناتے پھر رہے ہیں کہ ہوئے ہو تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

پھر علماء کرام سے معذرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ علماء کی اکثریت اس معاشرے پسے ہوئے اور معاشی ناہمواری کے ستائے ہوئے طبقوں کے مسائل معلوم کرنے، ان کی مشکلات کا جائزہ لینے، ان سے میل جول رکھنے، اور انہیں اپنی رفاقت کا احساس دلانے سے گریزاں ہے حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت خود کو محنت کشوں اور معاشرہ کے مظلوم طبقوں کے ساتھ وابستہ رکھنا ہے لیکن آج علماء کرام سہل پسندی کے ہاتھوں اس سنت نبوی سے محروم ہوتے جا رہے ہیں ان حالات میں کمیونزم کا مقابلہ اور سدباب خالی خولی محاذ آرائی کی فضاء قائم کر کے نہیں بلکہ تکنیکی اور منطقی طرز عمل اختیار کر کے ہی کیا جا سکتا ہے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اور نازک ذمہ داری علماء کرام پر عائد ہوتی ہے کہ وہ مروجہ نو آبادیاتی معاشی اور معاشرتی نظام کی غیر اسلامی حیثیت کی دو ٹوک وضاحت کریں اور اس غلط فہمی کو جرأت اور استقامت کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں کہ موجودہ نظام کو اسلام یا علماء کرام کی پشت پناہی حاصل ہے کیونکہ اس امر کی عملی اور دو ٹوک وضاحت کے بغیر کمیونزم کی کسی بھی عنوان سے مخالفت نوآبادیاتی نظام کی حمایت سمجھی جائے گی جو نہ صرف علماء کرام بلکہ اسلام کے عادلانہ نظام کے بارے میں خطرناک منفی نتائج پیدا کر سکتی ہے ہمارا موجودہ معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ طبقاتی تقسیم اور دولت کے سرکاری ذرائع کی ترجیحانہ تقسیم کی بنیاد پر استوار ہے اور یہ دونوں اصول اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہیں اس لیے کہ اسلام معاشرہ میں طبقات کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا نہ رنگ و نسل کے اعتبار سے، نہ مال و دولت کے اعتبار سے، نہ قوت و اختیار کے لحاظ سے اور نہ ہی کسی اور نقطہء نظر سے اسلام سے قبل یہ تقسیم اور

ترجیحات موجود تھیں لیکن اسلام نے اسے یکسر مٹا دیا اسلام نے جائز ذرائع سے دولت کمانے کی اجازت ضرور دی ہے اور حلال دولت کا ذخیرہ کرنے سے بھی نہیں روکا لیکن دولت کی ایسی نمائش اور معیار زندگی کو معاشرہ کے عام معیار سے مختلف اور بلند کرنے کی اجازت نہیں دی کہ اسی سے طبقاتی تقسیم جنم لیتی ہے خلافت راشدہ اسلامی نظام کا آئیڈیل معاشرہ ہے اس پر ایک نظر ڈالیے کہ معاشرے میں امیر المومنین ،گورنر عمال اور دیگر ارباب اختیار موجود تھے حضرت عبد الرحمن بن عوف حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے اصحاب ثروت موجود تھے حضرت بلال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما جیسے مفلس بھی موجود تھے لیکن نہ حکمران طبقہ نے اپنے لیے امتیازی معیار تقاضا کیا اور نہ ہی اصحاب ثروت نے الگ بستیاں بسانے کو پسند کیا بلکہ معاشرہ کے تمام افراد کے درمیان معیار زندگی کی یکسانیت نے ایسی بہار پیدا کر دی جو خلافت راشدہ کی اصل روح ہے یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کے سب سے نچلے طبقہ غلاموں کے بارے میں حکم دیا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں جنہیں خدا نے تمہارا ماتحت کر دیا ہے پس تم میں سے جس شخص کے تحت اس کا بھائی ہو تو اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے وہ پہنائے جو خود پہنتا ہے اور اس کی طاقت سے زیادہ کام اس پر نہ ڈالے (بخاری)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک اور غلام کے درمیان معیار زندگی کی یکسانیت کی ہدایت فرمائی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس پر عمل کر کے دکھایا سوال یہ ہے کہ اگر مالک اور اس کے زر خرید غلام میں معیار زندگی کی برابری اسلام کا ایک روشن اصول ہے تو آج کا کارخانہ دار اپنے آزاد مزدور اور اپنے درمیان معیار زندگی کی مساوات کا اصول قبول کرنے سے کیوں جھجکتا ہے؟ اور اگر خلافت راشدہ میں معیار زندگی کے لحاظ سے طبقاتی تقسیم کا

کوئی وجود نہیں ہے بلکہ پہلے سے موجود طبقاتی تقسیم کی عمارت ڈھا کر اس کے کھنڈرات پر خلافت راشدہ کا غیر طبقاتی معاشرہ استوار کیا گیا ہے تو آج ایک ہی معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان اس ہوشربا تفاوت کا کیا جواز ہے جس کا انداز شادمان کالونی اور کچی آبادی کے مکینوں کے درمیان معیار زندگی کے تفاوت پر ایک نظر ڈالنے سے بآسانی ہو سکتا ہے اسی طرح دولت اور اس کے قومی ذرائع کی ترجیحانہ تقسیم بھی اسلام کے سراسر منافی ہے انسان انفرادی طور پر جائز ذرائع سے جس قدر چاہے دولت کما لے لیکن دولت کے قومی ذرائع پر معاشرہ کے تمام افراد کا حق یکساں ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد جب بحرین وغیرہ سے آئے ہوئے مال کو مدینہ منورہ کے شہریوں میں برابر تقسیم کر دیا تو کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے فضیلت والے حضرات اور غیر فضیلت والے حضرات کو مساوی حصہ دیا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فضیلت کا معاملہ اللہ پاک کے ساتھ ہے اس کا ثواب وہ دیں گے وھذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الأثرۃ کتاب الخراج) یہ معیشت ہے اس میں برابری کا اصول ترجیح سے بہتر ہے اور خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معیشت میں مساوات کی بنیاد پر دولت کی تقسیم کو صحیح اصول قرار دیا ہے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت سے پہلے امام مہدی کے ظہور کا تذکرہ کیا فرمایا کہ جب وہ ظاہر ہوں گے خدا کی زمین ظلم وجور سے پر ہو گی اور امام مہدی اسے عدل و انصاف سے بھر دیں گے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

يقسم المال صحاحا"، فقال له رجل: ما صحاحا؟ قال: "بالسوية بين الناس

رواہ احمد امام مھدی دولت کو صحیح طریقے سے تقسیم کریں گے ایک شخص نے پوچھا صحیح طریقہ کیا ہے فرمایا لوگوں کے درمیان مساوات کی بنیاد طور پر الغرض خلافت راشدہ کی طرز پر

غیر طبقاتی معاشرہ کی تشکیل اور دولت کے قومی ذرائع کی مساویانہ تقسیم اسلام کے نظام عدل کی مستحکم بنیادیں ہیں جس کے بغیر اسلامی نظام کے حقیقی نفاذ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اسلامی نظام کی یہی بنیاد کمیونزم کے راستے میں ناقابل شکست رکاوٹ بن سکتی ہے ورنہ نوآبادیاتی دور کی یادگار موجودہ معاشرتی و معاشی ڈھانچہ کمیونزم کے چیلنج کا سامنا کرنے کی سکت نہیں رکھتا ارباب اختیار علماء کرام اور اسلامی نظام کے نفاذ کی دلی خواہش رکھنے والے عناصر اس حقیقت کا جتنی جلدی ادراک و اعتراف کر لیں ملک و قوم کے حق میں اتنا ہی بہتر ہو گا۔

نفاذ اسلام اور ہمارا نظام تعلیم

پاکستان کا قیام ایک صحت مند اور مثالی معاشرہ کی تشکیل کے لئے عمل میں لایا گیا تھا اور اس سلسلہ میں قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم سمیت بانیان پاکستان کے واضح اعلانات تاریخ کا انمٹ حصہ ہیں جن میں اسلام کے مکمل عادلانہ نظام کے نفاذ اور قرآن و سنت کی بالادستی کو پاکستان کی حقیقی منزل قرار دیا گیا ہے لیکن بد قسمتی کی بات ہے کہ دنیا کے نقشے پر اس نظریاتی ملک کو نمودار ہوئے پون صدی کا عرصہ گزر گیا ہے مگر ابھی تک ہم اسلامی نظام کی منزل سے بہت دور ہیں بلکہ اب تو پاکستان کی نظریاتی حیثیت کو ختم کرنے اور سیکولر ممالک کی صف میں شامل کرنے کے لیے عالمی قوتیں اور ان کی نمائندہ لابیاں پوری قوت کے ساتھ مصروف عمل نظر آتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنوبی ایشیا بلکہ عالم اسلام کے حوالے سے عالمی قوتوں کے ایجنڈے کا سب سے اہم نکتہ یہی مسئلہ بن گیا ، ہے کہ پاکستان اور پاکستانی قوم کو ہر قیمت پر اسلامی شناخت اور کردار سے محروم کر کے ویسٹرن سولائزیشن اور سیکولرزم کی پٹڑی پر چڑھا دیا جائے تاکہ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والا یہ ملک اسلام کی نشاۃ ثانیہ ، ملت اسلامیہ کی

وحدت اور اسلامی فلاحی معاشرے کے احیاء کے لئے کوئی کردار ادا نہ کر سکے حالات کا اگر تھوڑی ہوڑی سی گہری نظر سے جائزہ لیا جائے : تو اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں ہمارا 76 سالہ اجتماعی طرز عمل اس ضمن میں عالمی سیکولر قوتوں کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنا ہے اس لیے صرف انھی کو الزام دینے اور کوستے رہنے کی بجائے ہمیں اپنے قومی طرز عمل اور کردار کا بھی حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیے اور ان اسباب کا کھلے دل کے ساتھ تعین اور اعتراف کرنا چاہیے جو ہماری قومی زندگی کو اس تذبذب اور دوراہے پر لانے کا باعث بنے ہیں ہم قیام پاکستان کے بعد پون صدی تک اسلامی نظام کی منزل کی طرف عملی پیشرفت کیوں نہیں کر سکے؟ وقت آ گیا ہے کہ سوال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور قوم کا ہر طبقہ گریبان میں جھانک کر اپنے رویے اور کردار میں اس ناکامی کی جڑیں تلاش کرے تاکہ ہم گزشتہ کوتاہیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی نظام کی منزل کی طرف پیشرفت کر سکیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مناسبت سے نفاذ اسلام کے قومی سفر میں، نظام تعلیم، کے کردار پر ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ قوموں کی ذہنی نشوونما، فکری ارتقاء اور تہذیبی ترقی میں نظام تعلیم کا رول سب سے اہم اور بنیادی ہوتا ہے اور اس نقطہء نظر سے جب ہم اپنے نظام تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اپنی پالیسیوں اور ترجیحات کے لحاظ سے نفاذ اسلام کبھی ہمارے نظام تعلیم کے مقاصد میں شامل ہی نہیں رہا اسلامی نظام کے نفاذ میں معاشرہ کے چار طبقات کا کردار سب سے اہم اور بنیادی ہوتا ہے مقننہ -2 - عدلیہ -3 انتظامیہ 4 علماء کرام 1 آج کے دور میں کسی معاشرہ میں قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی، قوانین کی تطبیق و تشریح ان پر عملدرآمد اور ان معاملات میں علمی و فکری رہنمائی انہیں چار طبقات کا کام ہے اور اگر ہم فی الواقع اسلامی اقدار و احکام کو معاشرے میں رائج کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ان طبقات کی تعلیم و تربیت

ذہن سازی اور کام کی نوعیت کے مطابق ان کی تیاری ناگزیر ہے لیکن ہمارے ہاں صورت حال اس سے قطعی مختلف رہی ہے مقننہ میں جانے والے افراد کی ایک بڑی تعداد اور عدلیہ و انتظامیہ کے تمام افراد ہمارے ریاستی نظام تعلیم کے تربیت یافتہ ہیں جسے عصری نظام تعلیم سے موسوم کیا جاتا ہے جبکہ علماء کرام اس پرائیویٹ نظام تعلیم سے گزر کر آتے ہیں جسے دینی مدارس کا نظام تعلیم کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہمارا قومی المیہ ہے کہ اب تک دونوں نظام ہائے تعلیم نے اپنے تیار کردہ افراد کی تعلیم و تربیت کو نفاذ اسلام کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کی اکثریت کو دین کی ضروری تعلیم سے آراستہ نہیں کیا جا سکا اور علماء کرام کی اکثریت آج کے نظام اور سسٹم کو سمجھنے کی استعداد و صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہو سکی یہی وجہ ہے کہ طبقاتی بعد کے ساتھ ساتھ ذہنی منافرت اور فکری انتشار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس سب کچھ کی ذمہ داری ہمارے ان دو نظام ہائے تعلیم پر عائد ہوتی ہے اور اس کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تعلیمی نظاموں کے اہداف اور ترجیحات پر نظر ثانی کے ساتھ ساتھ دینی و عصری تعلیم اور عملی و اخلاقی تربیت کے تقاضوں کو یکجا کر کے ایک نظام میں سمو دیا جائے عصری علوم و فنون اور اسلامی تعلیمات کو یکجا کرنے کی سوچ نئی نہیں ہے علی گڑھ اور دیوبند کی تاریخ کی طرح اس سوچ کی تاریخ بھی کم و بیش ڈیڑھ صدی ہے ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ ملیہ دہلی اور جامعہ عباسیہ بہاولپور کے پیچھے یہی سوچ کارفرما تھی اور اب بھی ملک کے مختلف حصوں میں یہ سوچ تجربات کے مراحل سے گزر رہی ہے لیکن ابھی تک اس سوچ کو قومی تحریک کی شکل نہیں دی جا سکی حالانکہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ایک ایسے نظام تعلیم کی ہے جو نئی نسل کو آج کے ضروری علوم و فنون کی مہارت کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات اور دینی و اخلاقی تربیت

سے پوری طرح آراستہ کر سکے کیونکہ پون صدی کی تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ قومی زندگی کی گاڑی انہی دو پہیوں کے توازن کے ساتھ صحیح رخ پر آگے بڑھ سکتی ہے اور اگر ہم ان دونوں پہیوں کا باہمی توازن قائم نہ کر سکے تو قومی زندگی کو لڑکھڑاہٹ کی موجودہ کیفیت سے نکالنا ممکن نہیں ہو گا اور نہ ہی نفاذ اسلام کی منزل تک سفر جاری رکھا جا سکے گا۔

التغریب (Modernism)

مغربیت زدگی یہ تحریک بتاتی ہے کہ مذہب ایک فرسودہ اور اذکار رفتہ چیز ہے جو چیز حواس مشاہدے، تجربے، اور عقلیت کے زمرے میں نہ آئے وہ قابل ترک ہے چاہے وہ قومی رسم و رواج ہو یا مذہبی عقائد و اقدار مغربی تہذیب کا شجرہ نسب بیسویں صدی کی مغربی تہذیب جیسا کہ بعض سطحی النظر سمجھتے ہیں کوئی ایسی نو عمر تہذیب نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں ہوئی ہے دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال کی پرانی ہے اس کا نسبی تعلق یونانی اور رومی تہذیب سے ہے ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام اجتماعی فلسفہ اور عقلی و علمی سرمایہ چھوڑا تھا اس کے حصے میں آیا اس کے سارے رجحانات اور خصوصیات اس کو نسلاً بعد نسل منتقل ہوئے یونانی تہذیب مغربی ذہنیت کا سب سے پہلا واضح مظہر اور نمونہ تھی یہ پہلا تمدن تھا جو خالص مغربی فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہوا اور اس میں مغربی نفسیات کا پورا ظہور ہوا یونانی تہذیب کے کھنڈر پر رومی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی جس میں ایک ہی مغربی روح کام کر رہی تھی مغربی قومیں صدیوں تک ان دونوں تہذیبوں کی خصوصیات اور مزاج ان کے فلسفہ، علوم و ادب و افکار کو سینہ سے لگائے رہیں انیسویں صدی میں انہیں خصوصیات کے ساتھ انہوں نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا اس لباس کی چمک دمک سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ نیا ہے لیکن اس

کا تانا بانا یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے مثلاً یونانی تہذیب کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ:

1۔ خشوع و خضوع اور روحانیت کی کمی

2۔ دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی لذائذ فوائد کا اہتمام شدید

3۔ حب الوطنی میں افراط و غلو

4۔ ہم ان متعدد اجزاء اور پہلوؤں کو اگر ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے تنہا مادیت کا لفظ کافی ہے

یونانیوں کی زندگی میں خدا کی کوئی ضرورت اور اس سے کوئی تعلق اور دلچسپی نہ تھی خدا کا تصور بس اتنا سا تھا کہ نہ اس سے کوئی امید تھی اور نہ اس کا کوئی خوف ، نہ دل میں اس کی کوئی ہیبت تھی نہ محبت نہ ضرورت کے وقت کوئی دعا نہ التجاء بس وہ ایک معزول و معطل ہستی ہے جس کو عالم میں تصرف کرنے کا نہ کوئی اختیار ہے نہ طاقت اور ان کی دنیوی زندگی سے انتہائی شوق و محبت اس کی قدر و قیمت میں افراط و غلو، مجسموں اور تصاویر کے شغف، سرور و موسیقی کے کے انہماک، فنون لطیفہ کی قدر دانی اور غیر محدود شخصی آزادی پر مبالغہ آمیزی لطف اندوزی بوالہواسی روشن خیالی نے اخلاق و معاشرت پر برے اثرات ڈالے آج کے دور کا روشن خیال اور زندہ دل انسان اس سے ذرا مختلف نہیں معلوم ہوتا اگر اس سے کہا جاتا ہے کہ انسان کے سارے شوق اور خواہشات یکسان قابل احترام اور تعمیل کے لائق نہیں بعض خواہشات پسندیدہ اور لائق احترام ہیں اور ان کی تکمیل و تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں اور بعض ناروا و ناپسندیدہ ان

سے اجتناب ہی بہتر ہے اور ان پر پابندی اور بندش عائد کرنا ضروری ہے وہ شخص اس صحیح قانون کو قبول نہیں کرتا اور اس کے سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا جب اس کے سامنے یہ معقول باتیں پیش کی جاتی ہیں تو وہ تمسخر کے ساتھ اپنا سر ہلاتا ہے اور بڑے زور کے ساتھ یہ تقریر کرتا ہے کہ انسان کی تمام خواہشات اور اس کے سارے شوق یکساں قابل احترام ہیں اسی کے مطابق وہ اپنی زندگی بھی گذارتا ہے اور اپنی تمام خواہشات نفس کی تسکین اور اپنے ہر شوق کی تکمیل کرتا رہتا ہے اور جس وقت اس کا جس بات کا جی چاہتا ہے کر گزرتا ہے کبھی وہ مدہوش و بدمست، نغمہ و سرور میں مشغول ملے گا اور کبھی اس کو خیال آ جائے گا تو برت رکھ کر صرف پانی پینے پر اکتفاء کرے گا کبھی فوجی تربیت اور قواعد سیکھتا ہوا نظر آئے گا کبھی بالکل بیکار اور سست دکھائی دے گا غرض اس کی زندگی کا کوئی نظام اور ضابطہ نہیں ہے مغربی فطرت اور مزاج کا ایک خاصہ وطن پرستی ہے ایشیا کے مقابلے میں وطنیت کا جذبہ یورپ میں زیادہ قوی اور عام ہے مغرب میں مذہب کا اخلاقی اثر تقریباً فنا ہو چکا ہے جذبہ تقدس مٹ چکا ہے مغرب میں جو خاص خیال حاوی ہے وہ محض ملک گیری کا خیال اور مادر وطن کے لیے دوسری قوموں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور لوٹ کھسوٹ کرنا ہے رؤسا، امراء اور اونچے طبقے کے لوگ اپنے لیے فارغ البالی اور امارت کی زندگی کا سامان حاصل کرنے کے لیے کسی ظلم و بے دردی کو عیب نہیں سمجھتے مغرب کی جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے ان کی سلطنتیں منتہائے ترقی پر فائز ہو گئیں لیکن مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ اخیر کو پہنچ چکی ہے ان کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہیں عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر سے آزاد ہو چکی ہے۔

حکومت و کلیسا کی کشمکش

گیارہویں صدی عیسوی میں حکومت و کلیسا کی کشمکش شروع ہوئی اور اس نے بڑی شدت اختیار کر لی ابتداء میں پوپ کو اس جنگ میں فتح ہوئی اور پوپ کا اقتدار و اعزاز اتنا بڑھ گیا کہ شہنشاہ ہنری چھارم 1077 عیسوی میں اس بات پر مجبور ہوا کہ کانوسا کے قلعہ میں پوپ کے حضور میں حاضر ہو چنانچہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوا پوپ نے بڑی مشکل سے لوگوں کی سفارش پر اپنے سامنے کھڑا ہونے کی اجازت دی اور شہنشاہ ننگے پاؤں اون پہنے ہوئے آیا پوپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور پوپ نے غلطی معاف کی اس کے بعد حکومت و کلیسا کی آویزش میں کبھی پوپ کو فتح اور کبھی شکست ہوئی یہاں تک کہ انجام کار حکومت کے مقابلے میں کلیسا کو دبنا پڑا اہل کلیسا نے صاحب اقتدار و عوام پر جو بے پناہ ظلم کے پہاڑ توڑے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار روشن خیالوں اور ترقی پسندوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے مذہب و قدامت کے نمائندوں کے خلاف علم جنگ بلند کر دیا وہ مذہبی گروہ کے اس تشدد و جمود اور محکمہ احتساب کے ان مظالم سے ایسے بیزار اور مشتعل ہوئے کہ ان تمام عقائد علم اخلاق و آداب سے نفرت ہو گئی جن کی نسبت اس گروہ کی طرف کی جاتی ہے یا اس سے ان کا تعلق ثابت ہوتا ہے ان کے دل میں ابتداء مسیحی مذہب کے خلاف اور رفتہ رفتہ مطلق مذہب کے خلاف عداوت کا جذبہ پیدا ہو گیا روشن خیالی اور عقلیت کے علم برداروں نے بطور خود یہ طے کر لیا کہ علم اور مذہب ایک دوسرے کی ضد اور مقابل واقع ہوئے ہیں جو کبھی جمع نہیں ہو سکتے ان کے سامنے جب دین و مذہب کا نام آتا تو دفعتاً ارباب کلیسا کے لرزہ خیز مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی چنانچہ مذہب سے وحشت اور نفرت کو انہوں نے ایک اصول زندگی کے طور پر طے کر لیا اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی نفرت و کراہیت کا یہی ترکہ اور سرمایہ چھوڑا بہر حال جس کا خطرہ تھا وہ

پیش آ گیا اور یورپ کا رخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف ہو گیا خیالات، نقطہء نظر، نفسیات و ذہنیت اخلاق و اجتماع، علم و ادب حکومت و سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت غالب آ گئی ابتدا میں لوگ مدت دراز تک مادیت اور روحانی مذہب کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن مادی تہذیب کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مذہب اور رسوم اس کا ساتھ نہ دے سکے بالآخر مذہب کو برطرف کر کے صاف صاف لادینیت اور مادہ پرستی اختیار کر لی گئی۔

اہداف

1. صورت اسلام کو مسخ کر کے نیا اسلام تشکیل دینا۔
2. مسلمانوں کو اپنے ماضی سے شرمسار کرنا۔
3. مسلمانوں کو موجودہ حالات سے مایوس کرنا۔
4. مستقبل سے مایوس کرنا۔
5. امت کی شخصیات کو موم کی گڑیا بنا دینا۔
6. ماڈرن ثقافت کا فروغ۔
7. اسلامی تحریکوں اور قیادتوں کو سبوتاژ کرنا۔

وسائل الغزو الفکری

1. نظام تعلیم مثلاً تدریسی زبان کی تبدیلی۔
2. رسم الخط کی تبدیلی۔
3. غیر ملکی زبانوں کو لازمی قرار دینا۔
4. دین کا احترام ختم کرنا۔
5. لادینیت پر مبنی مواد کی شمولیت۔
6. علماء دین اور طلباء دین کی تحقیر۔
7. لادین مدرسین کا چناؤ۔

8. مخلوط تعلیم کا فروغ۔

9. دینی مدارس کے گرد گھیراؤ۔

10. دینی مدارس اور عصری تعلیمی اداروں میں خلیج۔

نصاب تعلیم کی خصوصیات

1. مغربی اقدار کا فروغ۔

2. ملحدانہ و مادہ پرستانہ ذہن سازی۔

3. تاریخ سے جاہل رکھنا۔

4. غلط تاریخ پڑھانا۔

5. مغرب اور مغربی ایجنٹوں کے مصائب اور زیادتیوں کو چھپانا۔

6. اسلامیات کو محض ایک نظری چیز بنا دینا۔

7. جغرافیائی اور سیاسی تقسیمات پختہ کرنا۔

نظام تعلیم پر گرفت کے اقدامات

1. عالمی سطح پر یونیسکو اور یونیسیف جیسے اداروں کا قیام۔

2. مسلم دنیا میں مغربی اداروں کے تحت ٹیچر ٹریننگ کورس کے پروگرام کا انعقاد وفروغ۔

3. تعلیمی شعبوں میں غیر ملکی امداد ۔

4. تعلیمی وزارتوں پر غیر ملکی ماہرین تعلیم کی اجارہ داری۔

5. مسلم درسگاہوں میں غیر ملکی مدرسین و دانش وروں کی آمدورفت۔

6. ذہین مسلم طلبہ کے لئے تعلیمی سکالر شپس۔

نظام تعلیم کے اثرات

1. طلبہ علم دین سے متنفر ہو گئے۔

2. علم دنیا اور علم دین کی راہیں الگ ہو گئیں ۔

3. ارباب اقتدار دن بدن دین سے دور ہو گئے ۔

4. مسلمان اپنی علمی وراثت سے قطعاً بیگانہ ہو گئے۔

5. علمی، تمدنی، سیاسی قیادت مغرب کے پاس چلی گئی ۔

6. دین اور اہل دین کا سرعام مذاق اڑانا معمول بن گیا۔

7. نسل نو ذہنی طور پر مغرب کی غلام بن گئی۔

8. میڈیا۔

ذرائع ابلاغ و معلومات

آج کے ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو، ٹی وی، اخبارات جرائد میگزین، نیٹ یعنی میڈیا نے فحاشی، عریانی اور بدکاری کو فروغ دینے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی باشعور شخص سے مخفی نہیں ہے فلمیں، ڈرامے، شوز، وغیرہ قتل و غارتگری، جنسی انارکی اور بے حیائی کے فروغ کا سب سے مؤثر ذریعہ بن چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ محتاط اور معاملہ فہم علماء کرام ذرائع ابلاغ کے افادی پہلوؤں کو نظر انداز کرنے کا الزام سہتے ہوئے بھی عام مسلمانوں کو ان سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اسکرین جن مناظر کو لوگوں کے سامنے لا رہی ہے ان کا غالب حصہ نئی نسل کی بربادی کا سبب بن رہا ہے اس سلسلہ میں روزنامہ پاکستان لاہور 17 مئی 1996 میں شائع ہونے والی خبر ملاحظہ فرمائیں۔ امریکی اداکارہ اور ماڈل گرل تیری کوئیلے نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سے وہ کسی ایسے اشتہار کے لیے ماڈلنگ نہیں کرائے گی جس سے بچوں اور نوجوانوں کو مسائل کا سامنا کرنا پڑے اس نے کہا کہ میں نہیں جانتی تھی کہ نوجوان ٹی وی اور فلموں میں خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر کتنے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے جذبات کی برانگیختگی انہیں کیا کیا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اس نے کہا کہ حال ہی میں وہ ہوائی جہاز میں آ رہی تھی وہاں اس نے دو لڑکوں کی گفتگو سنی جو اداکارہ شیرون ستون سے بہت متاثر تھے اور

آپس میں جو کچھ کہہ رہے تھے وہ انتہائی شرمناک اور تکلیف دہ تھا جب میں نے ان لڑکوں کو ایسے کرنے سے منع کیا تو پہلے تو وہ گھبرائے لیکن بعد میں مجھے پہچان کر کہنے لگے ہم کیا کریں ہم مجبور ہیں اور ہمیں ایسی باتوں پر مجبور کرنے والی آپ اداکارئیں ہیں تیری کوئیلے نے کہا تب ہی سے میں نے فیصلہ کرلیا کہ جذبات بھڑکانے والے اشتہاروں اور فلموں میں کام نہیں کروں گی۔

یہ تاثرات کسی مذہبی رہنما یا اصلاحی تحریک کے لیڈر کے نہیں بلکہ ایک اداکارہ کے اور وہ بھی 1996 کے ہیں جو ٹی وی اور فلموں کے نظام کا حصہ ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے اسلام نے اسی لیے بدکاری سے منع کرتے ہوئے اس کے دواعی و اسباب کی بھی ممانعت کر دی ہے کہ جو چیز بدکاری کا کسی درجہ میں سبب یا ذریعہ بن سکتی ہو وہ بھی حرام ہے اور قرآن کریم نے زنا سے منع کرتے ہوئے،، زنا نہ کرو کی بجائے،، زنا کے قریب مت جاؤ،، کا حکم دیا ہے جو انسانی فطرت اور انسانی معاشرہ کی ضروریات کے عین مطابق ہے اور آج کی انسانی سوسائٹی آخری حدوں کو چھو کر دن بدن فطرت کے تقاضوں کی طرف واپس لوٹ رہی ہے آئے کاش مغربی دنیا کے ان نئے رجحانات تک مسلمان ملکوں کے ان دانشوروں کی رسائی بھی ہو جائے جو آج مسلم معاشرہ کو نام نہاد آزادی کی اس دلدل کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں جس سے نکلنے کے لیے خود مغرب راستے کی تلاش میں ہے۔

البتہ زمینی حقائق ، معاشرتی حالات معروضی صورت حال سے آنکھیں بند کر لینا بھی دشمن کے لیے اپنے اہداف کو حاصل کرنے میں ان کا راستہ صاف کرنے کے مترادف ہوتا ہے مثلاً کچھ عرصہ پہلے تک صورت حال یہ تھی کہ عام آدمی اور جدید پڑھے لکھے افراد کے سامنے دین کے بارے میں یا دینی مسائل کے حوالہ سے جو معلومات علماء کرام پیش کرتے وہ انہی معلومات پر انحصار کرتے تھے ان کے پاس معلومات خود حاصل کرنے کے ذرائع نہیں ہوتے تھے اس لیے وہ

علماء کرام کی مہیا کردہ معلومات پر انحصار کر کے ان کے فیصلے وے کو آنکھیں بند کر کے مان لیا کرتے تھے آج یہ صورت حال نہیں ہے معلومات حاصل کرنے کے بہت سے دیگر ذرائع عام لوگوں کو میسر ہیں مثلاً ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، انٹرنیٹ، میڈیا، اور جدید دانشوروں کے حلقوں نے عام آدمی کے گرد دین کے مسائل کے بارے میں معلومات کا اور فتو متنوع اور وسیع حصار قائم کر دیا ہے یہ معلومات صحیح ہوں یا نہیں اس سے قطع نظر وہ بہر حال عام آدمی تک پہنچتی ہیں ہر پڑھا لکھا شخص ان کا علماء کرام کی مہیا کردہ معلومات سے موازنہ بھی کرتا ہے اور جو بات اس کے ذہن کو اپیل کرنے وہ اسے قبول کر لیتا ہے یہ ہمارے دور کا المیہ ہے کہ علم کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے اور معلومات کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے علم کے بغیر معلومات جو طوفان کھڑا کرتی ہیں وہ ہمارے اردگرد ہر طرف کھڑے ہو رہے ہیں مگر علماء کرام اس تبدیلی کا احساس کیے بغیر اپنی پرانی طرز پر قائم ہیں جو آج کے دور میں کافی نہیں ہیں علماء کرام آج کے لوگوں کو اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ حضرات کو ان معلومات کے ماحول سے الگ تو نہیں کر سکتے اور نہ ہی انہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ یہ معلومات حاصل نہ کریں جس نوجوان کو اپنی میز پر بیٹھے انٹرنیٹ پر ہر زمانے ہر علاقے ہر نوع کی معلومات حاصل کرنے کی سہولت میسر ہے اسے یہ بات کبھی اپیل نہیں کرے گی کہ وہ انٹرنیٹ نہ دیکھے ٹی وی پرو پروگرامز سے الگ رہے اس کے لیے خود علماء کرام کو معلومات کے سمندر میں گھس کر ان وسیع تر معلومات کے تناظر میں دینی راہنمائی کا اہتمام کرنا ہو گا آج کا نوجوان نہ آپ کی ڈانٹ سے مطمئن ہو گا اور نہ ہی فقط ڈانٹ سے آپ اسے راہ راست پر لا سکیں گے اس وجہ سے مطالعہ میں وسعت پیدا . کرنا ہو گی معلومات کا اضافہ کرنا ہو گا ورنہ سب سے پہلے عزت مجروح ہو گی پھر ثقاہت اور اگر علماء کرام کی ثقاہت مجروح ہو گئی تو دین کا نقصان ہو گا۔

آج دنیا میں نظریاتی، ثقافتی، علمی اور فکری لحاظ سے شکوک وشبہات کا جو جنگل آباد ہے اور فکری انتشار، تھذیبی خلفشار، ثقافتی یلغار کا جو دائرہ پھیل رہا ہے اس سے نئی نسل کو آگاہ کرنا، اس کو مستقبل کے خطرات سے نمٹنے کے لیے تیار کرنا علماء کرام کی ذمہ داری ہے اس سے غفلت و کوتاہی یا لاپرواہی کی سرے سے بلکل کوئی گنجائش نہیں ہے۔

میڈیا کے اہداف

1. شبہات پھیلانے کے لیے خبروں اور تجزیوں کی بھرمار کرنا۔
2. شہوات میں ڈبونے کے لیے تفریح مہیا کرنا جیسے موسیقی، رقص، فلمیں، ڈرامے۔
3. بے دین مصنفین، صحافیوں اور محققین کی مہارت فن سے لوگوں کو متاثر کرنا اور ہم خیال بنانا۔

میدان سیاست

جمہوری نظام اور سیاست کا میدان مغربی افکار و اقدار کے فروغ کا بہت بڑا ذریعہ ہے اس کے ذریعے مسلم راہنماؤں کو سیاست سے بے دخل کرنا ان کا اہم ہدف ہے جس کی مختصر کہانی کچھ یوں ہے کہ مغرب نے اٹھارویں صدی کے اختتام پر انقلاب فرانس کے ذریعے مذہب کے معاشرتی کردار کی نفی کر کے سول سوسائٹی کے نام پر لامذہبی سیاست و معاشرت کے دور کا آغاز کیا تھا تو مغرب میں بادشاہت جاگیرداری اور پاپائیت کے صدیوں پر محیط مشترکہ ظلم و جبر کے پس منظر میں بات کچھ سمجھ میں آ رہی تھی لیکن جب اس فکر و فلسفہ کو پوری دنیا تک پھیلائے اور بالخصوص عالم اسلام کو اس کی لپیٹ میں لانے کی مہم کا آغاز کیا گیا تو بات سمجھ سے بالاتر ہو گئی اور عقل و شعور نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اس لیے کہ بادشاہت جاگیرداری

پاپائیت کی تکون کا جو مشترکہ ظالمانہ کردار، تاریک صدیوں کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے عالم اسلام اس پس منظر سے یکسر خالی تھا جس رد عمل کا اظہار یورپ کی سول سوسائٹی نے انقلاب فرانس کی صورت میں کیا تھا وہ امت مسلمہ کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی اس لیے کہ عالم اسلام میں مذہب کا کردار ہمیشہ غریب دوستی عدل و انصاف اور حق پرستی کا رہا ہے بالخصوص اسلام کے عدالتی نظام نے بادشاہت اور حکمران طبقوں کے خلاف عوام کو جو انصاف اور تحفظ مسلسل بارہ سو برس تک فراہم کیا ہے اس کی مثال دنیا کی کو روکنے کے لیے جبر و کارفرما ہے کہ مذہب کے معاشرتی کردار کی نفی کو پوری دنیا سے منوایا جائے اور خاص طور پر مسلمانوں کو ان کے مذہب کے قومی و سیاسی کردار اور ان کی تہذیب و ثقافت سے محروم کر کے مغرب کے مذہب کے معاشرتی کردار کی نفی پر مبنی فلسفہ و نظام ان سے منوایا جانے مغرب نے انقلاب فرانس کے ذریعہ دنیا کو پیغام دیا تھا کہ اب سول سوسائٹی ہی سب کچھ ہے ہے اور ! کسی بھی ملک کے نظام و ثقافت کی بنیاد صرف اسی بات پر ہو گی کہ اس ملک کی سول سوسائٹی کی خواہش کیا ہے مغرب اس خوشنما ڈھول، کو دو صدیوں سے مسلسل پیٹے جا رہا ہے ہے لیکن عالم اسلام اسی سول سوسائٹی کے ذریعہ اگر مذہب کو واپس لاتا ہے تو مغرب کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور وہ اس کو روکنے نے کے لیے ہر حربہ اختیار کرتا ہے اس : تشدد، لالچ، لابنگ اور دباؤ کے تمام وسائل بروئے کار اگر کسی کو یقین نہیں آتا مصر میں صدر مرسی اور الجزائر میں اسلامک سالویشن لانے سے بھی دریغ نہیں کرتا پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔

مغرب نے اپنا مخصوص معاشرتی پس منظر اور اس پر اپنا ہی مخصوص ردعمل عالم اسلام پر مسلط کرنے کی کوشش شروع کر دی تو امت مسلمہ اور مغرب کے درمیان اس کشمکش کا آغاز ہو گیا جسے ثقافتی جنگ کہنے سے ابھی تک انکار کیا جا رہا ہے لیکن اس کے پرت جوں جوں کھلتے جا

رہے ہیں مغرب کا ثقافتی تعصب اور مغربی تہذیب و فلسفہ کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کی خواہش بے نقاب ہوتی چلی جا رہی ہے اب تو عالمی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے نام پر اقوام و ممالک کی خود مختاری کو پامال کرنے، لاکھوں افراد کے قتل عام اور مسلسل ڈرون حملوں تک بات جا پہنچی ہے جبکہ اس سب کچھ کے پیچھے یہی خواہش اور ضد کارفرما ہے کہ مذہب کے معاشرتی کردار کی نفی کو پوری دنیا سے منوایا جائے اور خاص طور پر مسلمانوں کو ان کے مذہب کے قومی و سیاسی کردار اور ان کی تہذیب و ثقافت سے محروم کر کے مغرب کے،، مذہب کے معاشرتی کردار کی نفی پر مبنی فلسفہ و نظام ان سے منوایا جائے۔

مغرب نے انقلاب فرانس کے ذریعہ دنیا کو پیغام دیا تھا کہ اب سول سوسائٹی ہی سب کچھ ہے اور کسی بھی ملک کے نظام و ثقافت کی بنیاد صرف اسی بات پر ہو گی کہ اس ملک کی سول سوسائٹی کی خواہش کیا ہے مغرب اس خوشنما ڈھول کو دو صدیوں سے مسلسل پیٹے جا رہا ہے لیکن عالم اسلام اسی سول سوسائٹی کے ذریعہ اگر مذہب کو واپس لاتا ہے تو مغرب کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور وہ اس کو روکنے کے لیے ہر حربہ اختیار کرتا ہے اس کو روکنے کے لیے جبر و تشدد، لالچ، لابنگ اور دباؤ کے تمام وسائل بروئے کار لانے سے بھی دریغ نہیں کرتا اگر کسی کو یقین نہیں آتا مصر میں صدر مرسی اور الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ کے حالات سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج اکثر ممالک میں جمہوریت فٹ بال کی طرح ہے خصوصاً پاکستان میں تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جمہوری سیاست کے اس میچ میں جمہوریت کی جو درگت بن رہی ہے شاید اس سے قبل اسے اس کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو اس لیے وہ ادھر سے ادھر لڑھکتے ہوئے یقیناً بنا یہ گنگا رہی ہو گی کہ۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے۔ نہ ہوتی میں تو کیا ہوتا۔

حکومتی ارکان اور اپوزیشن دونوں جمہوریت کے دفاع کی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں بیچارے امپائر کبھی اس کو آؤٹ کر دیتے ہیں کبھی اس کو اور رہی عوام تو وہ بیچاری کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھے جمہوریت کے کنویں کے گرد گھوم گھوم کر اپنے خون پسینے سے دونوں کو خوب سیراب کر رہے ہوتی ہے اور اپنے تیئں سمجھ رہی ہوتی ہے کہ ترقی و عروج کا بہت سفر کر لیا مگر جب پٹی کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ جہاں سے سفر شروع کیا تھا بریک وہیں پر لگی ہے بلکہ اس سے بھی دو چار قدم پیچھے ہی ہاں بس فرق اتنا ہوتا ہے کہ اس بیچاری عوام کا خون پسینہ بہہ چکا ہوتا ہے اور ان کے پیٹ کی زمین خوب سیراب ہو چکی ہوتی ہے اور ایک بار پھر کوئی اور سیاسی زمیندار اپنی پیٹ کی زمین کو سیراب کرنے کے لیے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے لیے تیار اور عوام اس کنویں کے گرد گھومنے کے لئے تیار اور افسوس کی بات یہ ہے کہ سال بسال اس میں رنگ اور ترنگ آتا جا رہا ہے جبکہ زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر بات کی جائے تو اسلامی ممالک کی عوام اگر ٹھیٹھ مذہبی ریاست نہیں چاہتے تو مذہب سے باغی ریاست کے حق میں بھی نہیں ہیں ان کے دل و دماغ میں شاید کسی خالص مذہبی ریاست کا نقشہ نہ ہو لیکن گزشتہ برسوں میں جو سروے ہوئے ہیں ان کے نتائج اس بات کو واضح کرتے ہیں ایک امریکی ادارے کی پاکستان کے سروے میں پاکستانی عوام میں سے 78 فیصد نے سختی سے اسلام کے نفاذ کی حمایت کی 17 فیصد کچھ نرم روی کے ساتھ اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں جبکہ صرف 2 فیصد ہیں جنہوں نے نفی میں جواب دیا اور افسوس یہ ہے کہ یہی 2 فیصد پوری قوم پر مسلط ہیں معلوم ہوا جہاں جمہوریت اور عوام کی مرضی کی حکومت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے وہ بھی محض دھوکہ ہے فریب ہے۔

قانون (Laws)

اسلامی ممالک میں مغربی قوانین کو نافذ کرنا اور اسلامی قانون کے لیے فقہاء ، مجتہدین، محدثین اور علماء کی صدیوں سے کی گئی محنت پر پانی پھیرنا اور ان مغربی قوانین کے نفاذ کے لیے بیورو کریسی سے کام لینا اہم حدف ہے ویسے تو بین الاقوامی قوانین معاہدات کی تعداد بیسیوں میں ہے اور ان میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے مگر اس معاملہ کا اصل رخ واضح کرنے کے لیے ہم سردست صرف چند امور کا ذکر کریں گے معاہدہ لوزان 1. ہم سے کہا جا رہا ہے کہ معاہدہ لوزان کے تحت ترکوں نے خلافت اور شریعت سے جو دستبرداری اختیار کی تھی وہ پوری ملت اسلامیہ کی طرف سے تھی اس لیے اس معاہدہ کی رو سے مسلمانوں کو دنیا کے کسی خطہ میں خلافت کے قیام اور شریعت کے نفاذ کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور بات صرف نہیں دی جا سکتی،، تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ عملی طور پر نہیں دی جا رہی پوری امت مسلمہ کو دنیا بھر میں خلافت اور شریعت کے حوالہ سے سب سے بڑی رکاوٹ یہی در پیش ہے اور مغرب ہر مرحلہ میں اس کی مزاحمت کر رہا ہے وہ خلافت جس کا صدیوں کی منصوبہ بندی کے ساتھ یورپ نے 1924 عیسوی میں خاتمہ کر دیا تھا اور جسے خود مسلمانوں کے ہاتھوں اس کے وجود اور تسلسل سے محروم کر دیا تھا اس کا خوف ابھی تک مغربی لیڈروں پر مسلط ہے اور وہ اس بات کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو رہے کہ عالم اسلام کے گرد گرد سیاسی، اقتصادی، سائنسی اور عسکری حصار اور اس کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اصل مقصد خلافت کے قیام کو روکنا اور مسلم ممالک میں اسلامی نظام و قوانین کے نفاذ کی کوششوں کو ناکام بنانا ہے آخری دور میں خلافت عثمانیہ اگرچہ ظاہری وسائل و اسباب کے حوالے سے ایک کمزور حکومت تھی اور اسے یورپ کا مرد بیمار،، کہا جاتا تھا لیکن اس خلافت نے پہلی دو صدیاں جس دبدبہ کے ساتھ گزاری ہیں اور

دنیا کے ایک بڑے حصے پر جس وقار اور رعب کے ساتھ حکومت کی ہے اس کی یاد مغربی دانشوروں کے ذہنو میں بدستور باقی ہے اور وہ دنیا میں خلافت کے ادارے کو دوبارہ وجود میں آنے کا موقع دینے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہیں اب سے کم وبیش سو برس پہلے کی بات ہے جب مغرب کے دانشوروں نے عربوں کو یہ سبق پڑھایا کہ ان پر عجمی حکمران خلافت کے نام سے حکومت کر رہے ہیں اس لیے انہیں عجمی خلافت سے چھٹکارا حاصل کر کے عربی بلکہ ہاشمی خلافت کے قیام کی طرف پیشرفت کرنی چاہیے اس کے ساتھ ہی ترکوں کو یہ سبق پڑھایا گیا کہ وہ یورپین ہیں اور بالاتر قوم ہیں اس لیے انہیں اسلام اور عربوں سے پیچھا چھڑا کر مغرب کے آزاد خیال اور ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہونا چاہیے عربوں اور ترکوں نے یہ سبق پڑھ لیا اور اس پر عمل بھی کیا گیا لیکن خلافت عثمانیہ کے خاتمے کو ایک صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود نہ عربوں کو، عرب خلافت کی منزل حاصل ہوئی اور نہ ہی ترکی یورپی یونین کی رکنیت حاصل کر سکا۔

بقول اقبال رحمۃ اللہ:

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا۔ سادگی اپنوں کی دیکھ غیروں کی عیاری بھی دیکھ۔

خلافت کے بارے میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں

1. خلافت کی شرعی اور دینی حیثیت
2. موجودہ حالات کے تناظر میں اس کی ضرورت و اہمیت

جہاں تک اس کے شرعی پہلو کا تعلق ہے خلافت ہمارے دینی فرائض میں سے ہے اور شریعت اسلامیہ کے ناگزیر تقاضوں میں سے ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ خلافت کا قیام دینی واجبات میں سے ہے اور فرض کفایہ ہے اگر دنیا کے کسی حصہ

میں خلافت موجود ہے تو دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا ہو جاتا ہے لیکن اگر خلافت کہیں بھی قائم نہیں ہے تو دنیا کے سارے مسلمان اس فریضہ کے تارک اور گناہ گار کہلائیں گے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اس پر دو دلیلیں دی ہیں

1۔ قرآن کریم کے بہت سے احکام پر عمل درآمد خلافت کے نظام پر موقوف ہے مثلاً حدود کا نفاذ، جہاد، نماز، زکوٰۃ کے باقاعدہ نظام کا قیام اور بیت المال کا معاشرتی کردار یہ سب امور حکومت کے فرائض میں سے ہیں اور ان پر عمل کے حکومت کا وجود ضروری ہے جبکہ شرعی اصول یہ ہے کہ جس کام پر کسی شرعی فرض کی ادائیگی موقوف ہو تو وہ خود بخود فرض ہو جاتا ہے اس لیے خلافت کا قیام بھی شرعی فریضہ ہے اور دینی تقاضوں میں سے ہے

2۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سب سے پہلے جس کام پر اتفاق کیا وہ خلافت کا قیام اور خلیفہ کا انتخاب تھا حتیٰ کہ اسے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین سے بھی پہلے سرانجام دیا گیا اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے اس لیے خلافت کا قیام ایک شرعی فرض کی حیثیت رکھتا ہے اس حوالے سے دیکھا جائے تو آج دنیا میں کسی جگہ بھی خلافت کا ادارہ موجود نہیں ہے اس لیے پوری امت اور ہم سب لوگ ایک شرعی فریضہ کے تارک اور گناہ گار ہیں اور ہمیں اس پر سنجیدگی سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے گناہ کے کے ساتھ غور کر کے اجتماعی ۔ اس دائرہ س۔ آواز آج کے حالات کے تناظر میں دو پہلوؤں سے اس مسئلہ کا تذکرہ کرنا چاہوں گا

1۔ ایک صدی کے تجربہ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ عالم اسلام کے مسائل اور 1 مشکلات پر عالمی سطح پر اٹھانے کے لیے. خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد کوئی فورم باقی نہیں رہا

مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں مسائل کی سنگینی میں اضافہ ہو رہا ہے اور بحرانوں کا دائرہ دن بدن وسیع ہو رہا ہے مگر بین الاقوامی سطح پر ان مسائل پر بات کرنے والا اور مسلمانوں کی نمائیندگی کرنے والا کوئی فورم نہیں ہے اور اب خلافت کی قدر و قیمت کا احساس ہو رہا ہے کہ اپنے آخری دور میں خلافت عثمانیہ جیسی کیسی بھی تھی مسلمانوں کے مسائل پر عالمی ماحول میں آواز اٹھائے والا کوئی فورم تو موجود تھا اور ان کی نمائندگی تو ہو جاتی تھی اب لے دے کر اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم ہے اور او آئی سی کا فورم ہے لیکن وہ اس قدر بے جان اور بے وزن ہے کہ یوں لگتا ہے کہ یہ ساٹھ کے لگ بھگ ایسے زیرو ہیں جن کے ساتھ کوئی عدد نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کی بجائے جگ ہنسائی کا باعث بن رہے ہیں اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ آج کے دور میں خلافت ہماری ملی ضرورت ہے اور ایک صدی کے تلخ تجربے نے ہم پر واضح کر دیا ہے کہ خلافت ہی ایک ایسا ادارہ اور فورم ہے جو عالم اسلام کے مسائل پر بین الاقوامی سطح پر مؤثر آواز اٹھا سکتا ہے اور مسلمانوں کی مؤثر نمائندگی کر سکتا ہے اس کے ساتھ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ گزشتہ پون صدی سے مختلف مسلم ممالک میں نفاذ شریعت ، نفاذ اسلام کے تجربات کیے جا رہے ہیں اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اس میں کامیابی کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی اور ہم ابھی تک زیرو پوائنٹ پر کھڑے ہیں بلکہ اس سے بھی پیچھے ہٹ رہے ہیں اکثر ممالک پر ابھی تک اندھیرا چھایا ہوا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے ہاں اب افغانستان کی فتح کے بعد کچھ سحر طلوع ہونے کے آثار نظر آنے لگے ہیں اللہ پاک ان کو سلامت رکھے تاقیامت رکھے بہر حال مجموعی طور پر اس ناکامی کی بنیادی وجوہات میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلامی قوانین کا نفاذ نوآبادیاتی نظام کے فریم ورک میں کرنا چاہ رہے ہیں اور ایسا ہونا عملاً ممکن نہیں ہے

ہمارا انتظامی عدالتی معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ نوآبادیاتی ہے اور اس میں ہم اسلام کی پیوند کاری کر رہے ہیں جس میں ہمیں مسلسل ناکامی کا سامنا ہے اس لیے کہ اسلامی نظام و قوانین کے لیے عدالتی اور انتظامی ڈھانچہ بھی اسلامی ہونا چاہیے بلکہ ضروری ہے اور معاشی و معاشرتی ماحول بھی اسلامی تقاضوں کو قبول کرنے والا ہونا چاہیے جو موجودہ مغربی نوآبادیاتی ڈھانچہ کی موجودگی میں نہیں ہو سکتا قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ اور اسلامی احکام و ضوابط کی عملداری کے لیے مناسب انتظامی ،معاشرتی معاشی اور عدالتی ڈھانچہ خلافت کے ادارے کے ذریعے ہی قائم ہو سکتا ہے۔

2۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نفاذ کی ذمہ داری کو قبول کرنے والے رجال کار کا بھی اسلامی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے مگر ہم ان دونوں باتوں کا لحاظ کیے بغیر نفاذ اسلام کے ناکام تجربہ میں مسلسل مصروف ہیں ور دوسری طرف اہل یورپ وقتاً فوقتاً اس خدشہ کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ اسلامی شدت پسند دنیا میں اسلامی خلافت لانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں ہمارے خیال میں اسلامی تحریکات کے خلاف اہل یورپ اور ان کے دیگر اتحادیوں کے غیظ و غضب کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مغرب نے اب سے ایک صدی قبل جس خلافت کو صدیوں کی مسلسل سازشوں کے بعد ختم کر دیا تھا اور اپنے زعم میں یہ خیال کر لیا تھا کہ اب دنیا میں کہیں بھی کوئی ریاست اسلام کی بنیاد پر قائم نہیں ہو سکے گی ان کا یہ اندازہ بلکہ پروگرام غلط ثابت ہوا اور صرف ایک صدی کے بعد پورے عالم اسلام میں نہ صرف جہاد کے جذبات اور جدو جہد از سر نو منظم ہو گئی ہے بلکہ مختلف ممالک میں خلافت اسلامیہ کے دوبارہ احیاء کی تحریکات بھی فطری انداز میں آگے بڑھ رہی ہیں اس لیے اہل یورپ کا یہ خوف بجا ہے لیکن ہم ان سے گزارش کرنا چاہیں گے کہ اس پر اس قدر سیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ اول تو یہ

ایک دینی فریضہ ہے جیسا کہ اوپر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے اور ثانیاً یہ اسلامی تحریکات خلافت کا نظام مغرب یا یورپ کی سرزمین پر قائم کرنے کا نعرہ نہیں لگا رہیں کہ اہل یورپ اور ان کے دیگر ہمنواؤں کو واویلا کرنے کی ضرورت پیش آئے بلکہ مسلمان صرف اپنے ملکوں میں نفاذ اسلام کی بات کرتے ہیں اور اس سرزمین پر نظام خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے پاس ہے اور جس میں وہ اکثریت کے ساتھ رہتے ہیں اس طرح خلافت کا قیام مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا حق بھی ہے کہ وہ اپنی سرزمین اور اپنی سوسائٹی میں جس طرح کا نظام وہ چاہیں قائم کر سکتے ہیں۔

اس لیے اہل مغرب کا یہ کہنا کہ اسلامی تحریکات دنیا میں خلافت کا نظام لانا چاہتی ہیں خلاف واقعہ تو نہیں لیکن مسلمانوں کے مذہبی فرائض اور ملی حقوق میں ناروا مداخلت کی حیثیت ضرور رکھتا ہے اور اسلام کے خلاف مغربی لیڈروں کی معاندانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔

انسانی حقوق، ہیومن رائٹس

اس وقت جو غزوفکری مسلمانوں اور مغرب کے درمیان ہے ان میں ایک اہم اور بنیادی موضوع انسانی حقوق، ہیومن رائٹس کا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ انسانی حقوق کا ہمارا تصور کیا ہے اور مغرب کا تصور کیا ہے ہمارے ہاں حقوق کا لفظ دو حوالوں سے بولا جاتا ہے۔

- حقوق اللہ
- حقوق العباد

قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں میں سینکڑوں نہیں ہزاروں صفحات ملیں گے جن میں حقوق اللہ اور حقوق العباد پر بحث کی گئی ہے اسلام ان دونوں کو الگ نہیں کرتا بلکہ ان دونوں میں ترجیح و تقدیم بھی ہے فرائض و واجبات میں ترجیح و تقدیم حقوق اللہ کی ہے اور نوافل مستحبات

اور مباحات میں ترجیح حقوق العباد کی ہے مغرب کے ساتھ ہمارا ایک تنازعہ تو یہ ہے کہ مغرب حقوق اللہ کو بالکل نظر انداز کرتا ہے ان کے ہاں اللہ کا کوئی حق نہیں ہے ان کے خیال میں پتہ نہیں اللہ ہے بھی یا نہیں مغرب میں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد خدا پر یقین ہی نہیں رکھتی فلسفہ میں اور اسلام کے فلسفہ میں یہ ہے کہ مغرب جو کچھ کے دوسرا فرق مغرب بھی طے کرتا ہے سوسائٹی کے حوالے سے طے کرتا ہے اور اسلام جو بھی طے کرتا ہے وحی کے حوالے سے طے کرتا ہے ہماری بنیاد وحی پر ہے اور مغرب کی بنیاد سوسائٹی پر ہے یہ دونوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے اسلام اور مغرب کے سارے جھگڑے کی بنیاد تقریباً یہی ہے مغرب والے کہتے ہیں کہ ہماری سوسائٹی بالغ ہو گئی ہے نابالغ بچے کو باپ کی انگلی پکڑنے کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ بالغ بچے کو نہیں جب سوسائٹی نابالغ تھی تب ہم آسمانی تعلیمات کی پیروی کرتے تھے اب سوسائٹی بالغ ہو گئی ہے اب یہ خود فیصلے کرے گی اسے کسی کی ڈکٹیشن کی ضرورت نہیں ہے مغرب کہتا ہے کہ ہم نے آزاد ذہن سے فیصلے کرنے شروع کر دیے ہیں ہم نے خدا، رسول، بائبل کا حوالہ ذہنوں سے اتار دیا ہے ہم کوئی قانون بناتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کیا کہتا ہے کوئی فیصلہ کرتے وقت ہم یہ نہیں دیکھتے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اس بارے میں کیا کہا ہم کوئی ضابطہ بناتے وقت بائبل سے یہ نہیں پوچھتے کہ بائبل اس بارے میں کیا کہتی ہے۔

مگر مسلمانوں نے ابھی تک خدا، رسول اور قرآن کا حوالہ اپنے ذہنوں سے چمٹایا ہوا ہے ان سے جب بات کرو کہتے ہیں کہ خدا نے یہ کہا ہے کسی مسئلے پر بحث کرو کہتے ہیں قرآن میں یہ لکھا ہے کسی عنوان پر بات کرو تو کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے یہ فرمایا ہے اہل مغرب کی یہ بات ٹھیک ہے اور ہم اس پر الحمد للہ ثم الحمد للہ کہتے ہیں کروڑ ہا شکر بجا لاتے ہیں کیونکہ مسلم سوسائٹی کی تمام تر خرابیوں کے باوجود آج بھی یہ کیفیت ہے کہ ہمارے ذہنوں میں خدا اور

رسول کا حوالہ قائم ہے ہمارے معاشرے میں اگر کسی کو قرآن کے خلاف بھی بات کرنی ہے تو حوالہ قرآن ہی سے لائے گا سنت کے خلاف کوئی بات کرے گا تو حوالہ سنت کا ہی دے گا آج بھی مسلم معاشرے میں قرآن و سنت کے حوالے سے ہٹ کر کوئی بات کہنا ممکن ہی نہیں ہے کوئی سننے کو تیار ہی نہیں ہے مسلم معاشرے میں اگر کسی نے کوئی بات کرنی ہے تو اسے قرآن سے کوئی آیت تلاش کرنی پڑے گی یا حدیث کا کوئی ٹکڑا ڈھونڈ کر لانا پڑے گا ہمارے ہاں بڑی خرابیاں ہیں بڑی کوتاہیاں ہیں بڑی بد عملی ہے لیکن الحمد للہ آج بھی ہمارے ہاں یہ حوالہ قائم ہے جبکہ مغرب کے لیے یہی حوالہ پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے ہم مغرب والوں سے کہتے ہیں کہ دنیا میں کہیں بھی کسی کونے میں، راستے میں چلتے ہوئے کسی مسلمان . کو روک لو اور اس سے ایک سوا ال کرو کہ قرآن مجید نے یہ بات کہی ہے جبکہ آج کی سائنس و فلسفہ، آج آج کی کی اقوام متحدہ یا آج : کی سوسائٹی یہ بات کہتی ہے تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے تو مسلمان دو ٹوک جواب دے گا کہ قرآن کی بات ٹھیک ہے چاہے اسے مسئلہ اور دلائل کا کچھ پتہ نہ ہو اسی طرح دنیا کے کسی مسلمان سے کہو کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے (نعوذ باللہ) یہ بات غلط کہی تھی ایک عالم محقق کی بات رہی ایک طرف ایک عام مسلمان بھی اس سے متفق نہیں ہو گا چاہے اس کے پاس دلیل ہو یا نہ ہو مغرب اسے کمٹمنٹ کا نام دیتا ہے جبکہ ہم اسے عقیدہ کہتے ہیں ہماری آج کی اس پوزیشن نے مغرب کو پاگل کر رکھا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مسلمان قرآن کریم یا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے حرمتی برداشت نہیں کرتا اور دوسرے ہم ان کو کہتے ہیں کہ تم ہم پر کس بات کا رعب جماتے ہو کہ ہم نے یہ حوالہ چھوڑ دیا ہے تمہارے پاس تھا کیا جو تم نے چھوڑا ہے تورات کہیں اپنی اصلی اور خالص شکل میں دنیا میں کہیں ہے؟ انجیل کہیں دنیا میں ہے ؟ زبور کہیں ہے؟ تم تو ان زبانوں کو بھی محفوظ نہ رکھ سکے جن زبانوں میں وہ

کتابیں نازل ہوئی تھیں جبکہ ہمارے پاس تو قرآن کریم بھی اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ بھی ہمارے پاس اصلی شکل میں موجود ہے ہم سے جو توقع کرتا ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں گے وہ بہت بڑا بے وقوف ہے اب میں انسانی حقوق کی مختصر سی تاریخ قارئین کے سامنے رکھتا ہوں اس کے بعد انسانی حقوق کا عالمی منشور اور اسلامی تعلیمات کا تقابل بیان کروں گا۔

میگنا کارٹا:

مغرب میں انسانی حقوق کے حوالے سے جو تاریخ بیان کی جاتی ہے اس کا آغاز میگنا کارٹا سے کیا جاتا ہے 1215 عیسوی میں برطانیہ کے کنگ جان اور جاگیر داروں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا معاہدہ اس عنوان سے ہوا تھا جس کا اصل مقصد تو بادشاہ اور جاگیر داروں کے مابین اختیارات اور حدود کار کی تقسیم کا مسئلہتھا لیکن اس میں عام لوگوں کا بھی کسی حد تک تذکرہ موجود تھا اس لیے اسے انسانی مغربی ممالک میں ایک عرصہ تک حکمرانی کا حق اور اس کے تمام تر اختیارات حقوق کا آغاز تصور کیا جاتا ہے تین طبقوں کے درمیان دائر رہے ہیں۔

- بادشاہ
- جاگیردار
- مذہبی قیادت

ان میں مختلف مراحل میں آپس میں کشمکش بھی رہی ہے لیکن عام شہری اس تکون کے درمیان جو دراصل جبر اور ظالمانہ حاکمیت کی تکون تھی صدیوں تک پستے رہے ہیں مغرب خود اس دور کو جبر و ظلم اور تاریکی و جاہلیت کا دور کہتا ہے اور اس تکون سے نجات حاصل کرنے کے لیے مغربی دنیا کے عوام کو طویل جدو جہد اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہے بہر حال

ان حکمران طبقات کی باہمی کشمکش کے پس منظر میں کنگ جان اور جاگیر داروں کے درمیان اختیارات کی باہمی تقسیم کے معاہدے کو، میگنا کارٹا، کہا جاتا ہے اور مغربی دنیا اسے انسانی حقوق کی ابتدائی دستاویز قرار دیتی ہے جو 1216 عیسوی میں 15 جون کو طے پایا تھا بل آف رائٹس اس کے بعد 1684 عیسوی میں عوامی بغاوت کے نتیجے میں انقلابی فوج نے پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کا قانون پیش کیا اور 1689 عیسوی میں برطانوی پارلیمنٹ نے بل آف رائٹس **(حقوق کا قانون)** کی منظوری دی جو اس سمت پیشرفت کا اہم مرحلہ تھا۔

امریکی دستور میں عوامی حقوق

ادھر امریکہ میں تھامس جیفرسن نے 12 جولائی 1776 عیسوی کو برطانوی استعمار کے تسلط سے امریکہ کی مکمل آزادی کا اعلان کیا اور 1789 عیسوی میں امریکی کانگریس نے دستور میں ترامیم کے ذریعے عوامی حقوق کو دستور کا حصہ بنا دیا۔

ڈیکلریشن آف رائٹس آف مین

فرانس میں زبردست عوامی جدو جہد اور بغاوت کے ذریعے 1789 عیسوی کو جاگیر داری، بادشاہت اور ریاستی معاملات میں چرچ کی مداخلت کو مسترد کر کے قومی اسمبلی سے شہری حقوق کا قانون، ڈیکلریشن آف رائٹس مین منظور کرایا اور پورے سیاسی اور معاشرتی نظام کی کایا پلٹ دی اسے انقلاب فرانس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مغرب میں ظلم و جبر اور حقوق کے درمیان حد فاصل قرار دیا جاتا ہے اسی انقلاب فرانس کے ذریعے نہ صرف بادشاہت اور جاگیر داری کا مکمل خاتمہ ہو گیا بلکہ اقتدار میں مذہبی قیادت کی شرکت کی بھی نفی کر دی گئی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چرچ پوپ اور مذہبی قیادت نے عوام پر بادشاہ اور جاگیر داروں کی طرف

سے ہونے والے دوہرے مظالم اور شدید جبر و تشدد میں عوام کا ساتھ دینے کی بجائے بادشاہ اور جاگیر دار کا ساتھ دیا تھا اور مذہب عملاً بادشاہت اور جاگیر داری کا پشت پناہ بن کر رہ گیا تھا اس لیے بادشاہ اور جاگیر دار کے ساتھ ساتھ پوپ کی سیاسی قیادت کا بستر بھی لپیٹ دیا گیا تھا اور نئے نظام میں ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا کہ مذہب اور چرچ کا تعلق انسان کے عقیدہ عبادت اور اخلاقیات کے ساتھ رہے گا جبکہ سیاسی و معاشرتی معاملات میں رائے دینے، راہنمائی کرنے اور مداخلت کرنے کا مذہب پادری اور چرچ کو کوئی حق نہیں ہو گا اسی کو آگے چل کر، سیکولرزم سے تعبیر کیا گیا اور اسی کو معیاری نظام قرار دے کر پوری دنیا سے اسے اختیار کرنے اور اس کی پابندی کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

لیگ آف نیشنز

یسویں صدی کے دوسرے عشرے میں 1914 عیسوی کے لگ بھگ پہلی جنگ عظیم ہوئی جس میں پوری دنیا کے ممالک بالواسطہ یا بلا با واسطہ لپیٹ . آ گئے اس لیے اسے ،، جنگ عظیم اول کا نام دیا جاتا ہے ہمارا بھی اس جنگ میں ایک کردار تھا اس کردار کی ہمیں ابھی تک سزا مل رہی ہے اس جنگ میں جرمنی ایک طرف تھا اور باقی یورپ دوسری طرف تھا ہم نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا اس کی شکست ہمارے لئے بہت بڑی مصیبت ثابت ہوئی اس وقت خلافت عثمانیہ قائم تھی جس کا مرکز ترکی تھا۔

خلافت عثمانیہ نے سپر پاور کے طور پر دنیا میں تقریباً ساڑھے چار سو سے پانچ سو سال گزارے ہیں درمیان میں دو صدیاں تو تقریباً ایسی رہی ہیں کہ اس وقت امریکہ کو دنیا میں جو پوزیشن حاصل ہے وہی پوزیشن سلطنت عثمانیہ کو دنیا میں حاصل رہی ہے اس وقت جیسے امریکہ کا

وائٹ ہاؤس ہے اس طرح سلطنت عثمانیہ کا ہیڈکوارٹر،، باب عالی کے نام سے ہوا کرتا تھا باب عالی کی مرضی کے بغیر دنیا میں کوئی چیز حرکت نہیں کرتی تھی امریکہ تو چند سالوں میں تھک گیا ہے جبکہ ہم نے صدیوں اس پوزیشن پر اپنا کردار ادا کیا ہے اور ان شاء اللہ تعالی ہمارا اگلا راؤنڈ بھی آنے والا ہے بس یہ درمیان میں ہمارا مار کھانے کا دورانیہ تھا ایک آدھ اور مار پڑے گی پھر ہماری باری ان شاء اللہ تعالیٰ راج کرنے کی شروع ہو گی خیر یہ ایک الگ موضوع ہے اگر اللہ پاک نے توفیق دی تو اس پر بھی قلم اٹھاؤں گا۔

پہلی جنگ عظیم میں بہت تباہی ہوئی تھی لاکھوں لوگ قتل ہوئے تھے جس کے بعد کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی تھی جس کا (League of Nations) انجمن اقوام بنیادی مقصد اقوام و ممالک کے درمیان تنازعات کو حل کرنا، تصادم کے امکانات کو روکنا، اگر تصادم ہو جائے تو درمیان میں ثالثی اور تحکیم کا کردار ادا کرنا وغیرہ لیکن لیگ آف نیشنز اپنے اس مقصد میں ناکام ہو گئی اور بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کے درمیان پھر عالمی جنگ بپا ہو گئی جس میں جرمنی اور جاپان ایک طرف جبکہ برطانیہ، فرانس اور روس و غیرہ دوسری طرف تھے اس جنگ نے پہلی جنگ سے زیادہ تباہی مچائی اور اس کے آخری مراحل میں امریکہ نے اتحادیوں کی حمایت میں جنگ میں شریک ہو کر جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جس پر جنگ عظیم دوم کا خاتمہ ہوا۔

یونائیٹڈ نیشنز

اس کے بعد 1945 عیسوی میں ایک اور بین الاقوامی تنظیم یونائیٹڈ نیشنز،، اقوام متحدہ کے نام سے وجود میں آئی جو ابھی تک نہ صرف قائم ہے بلکہ بین الاقوامی معاملات کا کنٹرول اسی کے

ہاتھ میں ہے اقوام متحدہ کا ڈھانچہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک جنرل اسمبلی اور ایک سلامتی کونسل ہے جنرل اسمبلی کا ہیڈکوارٹر امریکہ کے شہر نیویارک کے ایک جزیرہ میں میں ہے اس کے کچھ دفاتر سوئزر لینڈ کے شہر جنیوا میں بھی ہیں (Manhattan) بیتن جنرل اسمبلی کا ہر سال ستمبر میں اجلاس ہوتا ہے جو تین مہینے تک جاری رہتا ہے جس میں اس کا ہر ممبر شریک ہوتا ہے وہاں لمبی لمبی تقریریں ہوتی ہیں اور یہ دنیا کا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس پر دنیا کے کسی بھی ملک کا حکمران آ کر جو مرضی کہہ دے آپ وہاں جا کر برطانیہ کی بادشاہت کے خلاف بات کریں عیسائیت کے خلاف کریں دستور کے خلاف کریں آپ چاہیں وہاں گالیاں دیں جو مرضی کہہ دیں دل کی بھڑاس نکال دیں آپ کو پوری آزادی ہے یہ جنرل اسمبلی کی پہلی حیثیت ہے۔

دوسری حیثیت یہ ہے کہ جنرل اسمبلی کسی مسئلے پر کوئی قرارداد بھی پاس کر سکتی ہے لیکن اس قرارداد کی حیثیت بس سفارش کی ہوتی ہے اس وقت جنرل اسمبلی میں بے شمار قراردادیں پڑی ہوئی ہیں اسرائیل کے خلاف بے شمار ہیں انڈیا کے خلاف ہیں باقی ملکوں کے خلاف بھی ہیں بس وہیں گرد میں آتی ہوئی پڑی ہوئی ہیں ان پر عملدرآمد نہیں کیا جاتا کیونکہ ان کی حیثیت صرف سفارش کی ہے ہاں اگر کوئی مسلمانوں کے خلاف اور اہل کفر کے حق میں ہو تو پھر عمل کرنے میں دیر بھی نہیں لگائی جاتی اقوام متحدہ میں پالیسی سازی فیصلوں اور ان کے نفاذ کی اصل قوت، سلامتی کونسل ہے جس کے گیارہ ارکان میں سے پانچ ارکان مستقل ممبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

- امریکہ
- برطانیہ
- فرانس

- روس
- چین

یہ ہمیشہ رہیں گے ان کو دنیا کے ممالک سے ووٹ لینے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی جبکہ چھ ارکان دنیا کے مختلف ممالک سے باری باری دو دو سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں یہ غیر مستقل ممبر ہوتے ہیں اس کے گروپ تقسیم ہیں مثلاً اس دفعہ افریقہ سے ممبر آئے گا اور اگلی دفعہ ایشیا سے آئے گا دنیا کے ممالک ووٹ دے کر اپنا نمائندہ ملک منتخب کرتے ہیں یہ گیارہ رکنی سلامتی کونسل اقوام متحدہ کی اصل قوت اور اتھارٹی ہیں لیکن ان میں سے پانچ ارکان کو ویٹو پاور یعنی حق استرداد حاصل ہے کہ امریکہ، روس برطانیہ، فرانس، چین میں سے کوئی ایک ملک بھی سلامتی کونسل کے کسی فیصلے کو مسترد کر دے تو وہ کالعدم ہو جاتا ہے اس طرح پوری دنیا کے نظام پر اقوام متحدہ کے نام سے اصل حکمرانی اور کنٹرول ان پانچ ممالک کا ہے اور یہ پانچ ممالک جس بات پر متفق ہو جائیں پوری دنیا کو وہ بہر حال تسلیم کرنا ہوتا ہے اقوام متحدہ کا اصل مقصد تو قوموں اور ملکوں کے درمیان ہونے والے تنازعات کا حل تلاش کرنا اور جنگ کو روکنا ہے لیکن 10 دسمبر 1948 عیسوی کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا عالمگیر چارٹر منظور کر کے اور اس کی پابندی کو تمام ممالک و اقوام کے لیے لازمی قرار دے کر دنیا کے سیاسی اور معاشرتی نظام میں راہنمائی اور مداخلت کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل کر لیا اور اس کے بعد سے ممالک و اقوام کے درمیان جنگ کو روکنے کے ساتھ دنیا بھر کے ممالک کے سیاسی اور معاشرتی نظاموں کو کنٹرول کرنا بھی اقوام متحدہ کی ذمہ داری سمجھا جا رہا ہے اور اقوام متحدہ اس سلسلہ میں مسلسل کردار ادا کر رہی ہے کہا یہ جاتا ہے کہ اقوام متحدہ ایک بین الاقوامی تنظیم ہے اور اس کے تحت متفقہ طور پر یا اکثریت کے ساتھ طے ہونے والے فیصلے، بین الاقوامی معاہدات،،

کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ایک طالب علم کے طور پر مجھے اس سے اختلاف ہے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اپنے جن فیصلوں کو دنیا پر نافذ کرنا چاہتی ہے وہ عملاً نافذ ہوتے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنے والے ملکوں کو سزا دی جاتی ہے حتی کہ خلاف ورزی کرنے والے ملکوں پر فوج کشی بھی کی جاتی ہے اور انہیں اقوام متحدہ کا فیصلہ تسلیم کرنے پر بزور مجبور کیا جاتا ہے اس لیے انسانی حقوق کا چارٹر اور اقوام متحدہ کے دیگر فیصلے صرف معاہدات، نہیں بلکہ عملاً، بین الاقوامی قوانین، بن چکے ہیں اور خود اقوام متحدہ صرف بین الاقوامی تنظیم نہیں بلکہ عملاً ایک عالمی حکومت کا درجہ رکھتی ہے جس کے ذریعے سلامتی کونسل میں ویٹو پاور رکھنے والے پانچ ممالک عملاً پوری دنیا پر حکومت کر رہے ہیں اقوام متحدہ کے اس عملی کردار کو سامنے رکھنا بالخصوص عالم اسلام کے ان حلقوں کے لیے انتہائی ضروری ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ اسلامی معاشرہ کا قیام اور خلافت اسلامیہ کے احیاء کے لئے دنیا کے کسی بھی حصہ میں محنت کر رہے ہیں تاکہ انہیں یہ معلوم ہو کہ اس سلسلہ میں ان کا مقابلہ اصل میں کس قوت سے ہے ہمارے ہاں عام طور پر ایسی جدو جہد کرنے والے حلقے اور طبقے اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ ہم اپنے ملک میں اپنے مقتدر حلقوں سے نفاذ اسلام کا مطالبہ کر رہے ہیں یا ان سے نفاذ اسلام کے لیے لڑ رہے ہیں جبکہ حقیقی صورتحال یہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں نفاذ اسلام یا شریعت کے قوانین کی ترویج کی جدو جہد ہو اس کا سامنا اصل میں ایک بین الاقوامی نظام سے ہے اور ایک مضبوط عالمی نیٹ ورک سے ہے جو ساری دنیا میں انسانی حقوق کے چارٹر کے عنوان سے مغرب کا طے کردہ سیاسی اور معاشرتی نظام نافذ کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہے یہ تو تھا اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا پس منظر ، اب ہم اس چارٹر کی چند دفعات کا شق وار جائزہ لیتے ہیں اس میں دو باتیں زیر بحث آئیں گی۔

1. اس چارٹر کے حوالے سے بین الاقوامی حلقوں کے ہمارے قوانین پر کیا اعتراضات ہیں۔
2. اس چارٹر کے حوالے سے شرعی نقطۂ نظر سے ہمارے تحفظات کیا ہیں۔

دفعہ نمبر 1

انسان کی عزت و تکریم تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

تبصرہ

اصولاً ہمیں اس شق پر کوئی اعتراض نہیں ہے انسانی مساوات کی تعلیم تو ہمیں اسلام نے اس دفعہ سے پہلے ہی دے دی ہے البتہ اس دفعہ کی تطبیق کے لحاظ سے ہمارا ایک تحفظ ہے یہ کہتے ہیں کہ عزت و تکریم کے لحاظ سے سب انسان برابر پیدا ہوئے ہیں لیکن جب یہ تطبیق کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ عزت نفس کے اعتبار سے بھی سب انسان برابر ہیں اس میں ہمیں تھوڑا سا کلام ہے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ

ایک اور مقام پر ہے:

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ

اسی طرح ایک اور جگہ ہے:

اُولٰٓىٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ

ہم کہتے ہیں کہ سب انسان برابر پیدا ہوئے ہیں لیکن موت تک سب برابر نہیں ہیں، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ہمارے ہاں تکریم کی بنیاد تقویٰ پر ہے مجرم اور غیر مجرم کی تکریم برابر نہیں ہے کیونکہ اگر مجرم اور غیر مجرم تکریم میں برابر ہوں گے تو جرم کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہو گا۔

دفعہ نمبر 2

آزادی ہر شخص کا حق ہے ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اس حق پر نسل رنگ ،جنس ،زبان ،مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے کا قوم معاشرے، دولت خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

تبصرہ

اصولاً یہ دفعہ بھی ٹھیک ہے کہ تمام حقوق سب کے لیے برابر ہیں کوئی کالا، گورا، امریکی افریقی عربی عجمی آزاد ملک کا باشندہ ہے یا غلام ملک کا رہائشی ہے تمام حقوق میں سب برابر ہیں۔

دفعہ نمبر 3

جان کی آزادی اور تحفظ ہر شخص کو اپنی جان آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

تبصرہ

اس دفعہ سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے اسلام کا اصول یہی ہے۔

دفعہ نمبر 4

غلامی کا مسئلہ کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا غلامی اور بردہ فروشی چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو ممنوع قرار دی جائے گی۔

تبصرہ

اسے کہتے ہیں غلامی کا مکمل خاتمہ اسے تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے غلامی کا خاتمہ کیا ہے اور آپ لوگ . غلامی کے خاتمے پر ہم سے اتفاق بھی کرتے ہیں لیکن آپ پھر بھی اپنے اداروں میں غلامی پڑھا رہے ہیں قرآن میں

بھی غلامی پڑھا رہے ہیں احادیث میں بھی پڑھا رہے ہیں اور فقہ میں بھی پڑھا رہے ہیں ان کا ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم اپنے ان قوانین میں ترمیم کریں غلامی سے متعلقہ آیات قرآن سے نکالیں غلامی سے متعلقہ احادیث کے ابواب کتابوں سے نکالیں فقہ کی کتابوں سے غلامی کی بحثیں نکالیں اگر آپ نکال نہیں سکتے تو کم از کم ان کو پڑھانا چھوڑ دیں ہم ان سے کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے نہ قرآن کریم کے کسی قانون میں ردوبدل کا ہمیں اختیار ہے نہ صحیح احادیث میں سے کسی کا انکار ہمارے اختیار میں ہے دوسری بات اگر ہم ترامیم کا ایک مسودہ تیار کر لیں ایک ایجنڈہ بنا بھی لیں تو اس کی منظوری کس سے کروائیں گے اتھارٹی کون ہو گی اب قرآن کریم میں ترمیم کرنے کی یا احادیث میں ترمیم کرنے کی دنیا میں کوئی اتھارٹی تو ہے نہیں حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن میں ترمیم کرنے کا اختیار نہیں قرآن کریم میں مذکور ہے جب کفار نے مطالبہ کیا کہ

"انت بقرآن غیر ھذا او بدلہ"

"تو اللہ پاک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا کہ ان کو جواب دیجیے"

"آل مایکون لي ان ابدلہ من تلقاء نفسی"

"کہ اس کا اختیار میرے پاس نہیں ہے"

جب اتھارٹی ہے ہی کوئی نہیں تو خواہ مخواہ نہ اپنا وقت ضائع کرو نہ ہمارا ضائع کرو اب غلامی کیا ہے اور اس پر ہمارا مؤقف کیا ہے اس پر بات کرنے سے ان حضرات کا جواب سامنے آ جائے گا جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس زمانے میں کسی شخص کو غلام بنانے کے تین طریقے رائج تھے۔

1۔ ایک طریقہ تو وہ تھا جسے آج کل بردہ فروشی کہتے ہیں کوئی طاقتور آدمی کسی 1 کمزور آدمی کو پکڑتا تھا اور غلام بنا کر بیچ دیتا تھا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایسے ہی غلام بنے تھے وہ کسی غلام خاندان کے فرد نہیں تھے راہ چلتے کچھ طاقتور لوگوں نے انہیں پکڑا اور بیچ دیا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی ایسے ہی غلام بنے تھے علم کی تلاش میں سفر کر رہے تھے کچھ طاقتور لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے جنہوں نے غلام بنا کر بیچ دیا اسے آج کی اصطلاح میں بردہ فروشی کہتے ہیں۔

2۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کسی آدمی نے کوئی جرم کیا ہے یا اس کے ذمہ کوئی تاوان 2.. ہے تو عدالت نے پنچائت نے تحکیم نے، قضا نے اس شخص کو سزا کے طور پر غلام بنا دیا بلکہ بعض اوقات تو مجبور آدمی خود اپنے آپ کو کسی کی غلامی میں دے دیتا تھا مثلاً کسی پر کسی کا قرض ہے جسے وہ چکا نہیں سکتا تو آخر وہ ہار مان کر کہہ دیتا تھا کہ ٹھیک ہے میں تمہارا غلام ہوں مجھے بیچ کر اپنا قرضہ پورا کر لو یا خود مجھ سے کام لے لو۔

3۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ جنگی قیدی جو ہاتھ میں آتے تھے انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا 3.. جنگ کے دوران جو لوگ قید میں آ جاتے تھے ان کے میں مختلف آپشنز ہوتے تھے۔

1. انہیں قتل کر دیا جائے۔
2. فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔
3. کسی حکمت کے تحت ویسے ہی چھوڑ دیا جائے۔
4. قیدیوں کا تبادلہ کر دیا جائے۔
5. انہیں قید کر لیا جائے۔

قید کی پھر دو صورتیں ہوتیں تھیں۔

- انہیں قید خانے میں ڈال دیا جائے
- انہیں غلام بنا کر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے یعنی جیل کا قیدی یا گھر کا قیدی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوا کرتے تھے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو قید میں رکھنا مشکل تھا چنانچہ یہ قیدی خادم کے طور پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے یہ تین طریقے اس وقت غلام بنانے کے رائج تھے ان میں سے دو صورتیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل طور پر منع فرما دیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بردہ فروشی کو حرام قرار دے دیا اور جرمانے یا تاوان میں بھی کسی کو غلام بنانے کو حرام قرار دے دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی آزاد شخص کو بیچ کر اس کی قیمت کہا جائے اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود گا مدعی بنوں امریکہ میں غلاموں کی منڈیاں۔یہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے غلامی کو ختم کیا ہے ان کے ہاں تو ابھی ایک سو سال پہلے تک غلامی رائج رہی ہے امریکہ میں جو آج دنیا کا بڑا چودھری بنا بیٹھا ہے افریقہ سے بحری جہاز بھر بھر کر انسانوں کو لایا جاتا تھا اور امریکہ کی منڈیوں میں لا کر بیچ دیا جاتا تھا آج سے تقریباً سو سال پہلے تک امریکہ میں غلاموں کی منڈیاں موجود تھیں آزاد آدمی پکڑ کر لائے جاتے تھے اور منڈیوں میں بیچ دیے جاتے تھے امریکہ میں گزشتہ صدی تک غلامی کے جواز، عدم جواز کی بحث چلتی رہی ہے دلائل سے بھری پڑی ہیں یہ ابھی گزشتہ صدی کی بات ہے اور آج امریکہ آزادی کا گزشتہ صدی میں امریکہ میں جو شمال و جنوب کی جنگ ہوئی ہے اس جنگ کے دور میں امریکہ کے دانشوروں نے کتابوں کی کتابیں لکھیں جو غلامی کے جواز پر ٹھیکدار ہونے کا دعوی کرتا ہے

امریکہ میں رہنے والے افریقی نسل کے لوگوں کو 1964 تک ووٹ کا حق حاصل نہیں تھا خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس بات کو ابھی آدھی صدی ہی گزری ہے اور یہ لوگ دعوی کرتے ہیں کہ ہم نے غلامی ختم کی ہے جبکہ ہمارا دعوی ہے کہ غلامی سب سے پہلے اسلام نے ختم کی ہے بردہ فروشی اور بطور تاوان کے غلام بنانے کو اسلام نے آج سے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے ختم کر دیا تھا اور غلامی کی صرف تیسری صورت باقی رہ گئی تھی۔

غلامی کے بارے میں ہمارا مؤقف

یہاں پر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا اسلام نے غلام بنانے کا حکم دیا ہے یا غلامی کی جو ہے تین صورتیں رائج تھیں ان میں سے دو کو ختم کر کے ایک صورت کو بطور آپشن کے باقی رکھنے کی اجازت دی ہے؟ یعنی جنگی قیدی اگر آپ کے ہاتھ میں آ گیا تو کیا اسے غلام بنانا ضروری ہے یا آپ کی مرضی ہے کہ اس سے کس طرح فائدہ اٹھائیں؟ سزائے موت دے دیں، اپنے کسی قیدی کے ساتھ تبادلہ کر لیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیں، ویسے ہی رضا کارانہ چھوڑ دیں، قید خانے میں ڈال دیں یا اس سے ایسا کام لے لیں جو اس کے بس سے باہر نہ ہو گویا اسلام میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانا فرائض، واجبات حتیٰ کہ مستحبات میں سے بھی نہیں ہے بلکہ یہ تو مباحات میں سے ہے اور ایسا کوئی بین الاقوامی معاہدہ قبول کرنا جس سے کسی مباح پر اثر پڑے تو اس کے لیے اس مباح کو چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ہم نے ایسا ہی کیا ہے ہم نے غلامی کی ایک صورت کو عرف کے اعتبار سے مباح قرار دیا تھا اور آج کے عرف کے اعتبار سے مباح پر عمل کو ترک کیا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے البتہ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ ایسا ہم نے اصولاً نہیں کیا ہے بلکہ عملاً کیا ہے خدانخواستہ غلامی کے ایسے ے . حالات دنیا میں پھر پیدا ہو

جائیں تو ہم ان حالات سے نمٹنے کا راستہ کیوں بند کریں؟ اصولاً ہم اپنے مؤقف پر قائم ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات اصولاً اپنی جگہ پر قائم ہیں ہم احکام سے دستبردار نہیں ہوئے بلکہ تطبیق سے دستبردار ہوئے ہیں ایک مزید بات بھی سمجھنے کی ہے کہ ہمارا مغرب سے سوال ہے. تم اپنے عرف کو دائمی اور حتمی عرف کیسے کہہ دیتے ہو؟ آیا عرف کبھی دائمی رہا ہے؟ تعامل کبھی ابدی رہا ہے؟ یہ تو بدلتا رہتا ہے ایک بات خاص طور پر سمجھ لیجئے کہ جہاں ہمارے احکام صریحہ، نص قطعی اور نص صریحی متاثر نہ ہوتے ہوں وہاں ہم بین الاقوامی معاہدات کو قبول کرتے ہیں اور ان کا احترام بھی کرتے ہیں لیکن جہاں ہمارے احکام منصوصہ متاثر ہوں گے وہاں ہمیں ضرور اعتراض ہو گا اب اس امکان کی نفی تو نہیں کی جا سکتی کہ کبھی ایسا دور پھر واپس آ جائے جس کی یہ لوگ ہمیں دھمکیاں بھی دیتے ہیں کہ ہم تمہیں پتھر کے دور میں واپس بھیج دیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ پتھر کا دور پھر واپس آ جائے امکانات کو تو یہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں

ہمارا نقطہء نظر یہ ہے کہ اگر دنیا میں ایسا دور ایسے حالات دوبارہ آ جائیں کہ غلامی کی یہ صورت رائج ہو جائے تو ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس احکامات موجود ہیں ان احکامات سے ہم دستبردار نہیں ہوئے چنانچہ ہمارا مغرب کے دانشوروں سے ایک سادہ سا سوال ہے فرض کریں، ہم پتھر کے دور میں واپس چلے گئے ہیں اور کسی جنگ میں کچھ قیدی ہمارے ہاتھ لگ گئے ہیں ان قیدیوں کو ہم اپنی سیاسی اور جنگی حکمت عملی کے تحت نہ آزاد کر سکتے ہیں، نہ کسی قسم کے تبادلے میں چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہم انہیں قتل کرنا چاہتے ہیں اب ہمارے پاس دو صورتیں ہیں۔

- انہیں اجتماعی طور پر کسی قید خانے میں غیر محدود مدت کے لیے ڈال دیں۔

- انہیں مختلف خاندانوں کے حوالے کر دیں۔

یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس قیدی کے لیے بہتر صورت کون سی ہے آپ اس قیدی سے پوچھیں کہ وہ جیل میں رہنا چاہتا ہے یا کسی کے ساتھ گھر میں؟ مکمل غلامی چاہتا ہے یا نیم آزادی؟ قیدی سے پوچھیے کہ حقوق کے تعین کے ساتھ کسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے یا پھر بس جیل میں پڑا گلنا سڑنا چاہتا ہے ؟ آج کل کی جیلیں آپ دیکھ لیں ایک قیدی ایک لمبی قید گزار رہا ہے جب وہ اپنی قید کا ایک بڑا عرصہ گزار لیتا ہے تو اسے ضمانت پر کسی زمیندار کے پاس یا کسی رفاہی ادارے کی خدمت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی قید کا باقی عرصہ گذارتا ہے آپ اس قیدی سے پوچھیں کہ اس کے لیے وہ جیل کی چار دیواری بہتر تھی یا نیم آزادی کے ساتھ خدمت بہتر ہے؟ ایک عورت کے لیے جیل میں سڑنا بہتر ہے یا حقوق کے تعین کے ساتھ کسی کے ساتھ رہنا بہتر ہے ؟ جواب میں کوئی قیدی بھی جیل میں رہنا پسند نہیں کرے گا عرض یہ ہے کہ اسلام نے غلامی کی تین قسموں میں سے ایک قسم کی اجازت دی ہے اور اس قسم پر بھی عمل کی نوبت بہت سے آپشنز کے بعد آتی ہے کہ جب ایک جنگی قیدی کو فدیہ لے کر نہ چھوڑنا ہو، قیدیوں کے تبادلے میں رہا نہ کرنا ہو، سزائے موت نہ دینی ہو وغیرہ تو ایسی صورت میں اسے قید میں ڈال کر اس کی زندگی کو بالکل ہی بے مقصد بنانے کی بجائے اسے حقوق کے تعین کے ساتھ کسی کے ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی جائے میں پورے شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ ایسی صورت میں قیدی کا بہترین مفاد اسی میں ہے کہ اسے جیل میں ڈالنے کی بجائے کسی کا غلام بنا دیا جائے جہاں اسے زندگی کے کچھ نہ کچھ حقوق میسر ہوں۔

دفعہ نمبر 5

اسلام میں جرم و سزا کے قوانین کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی تبصرہ اس دفعہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی شخص کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کریں گے جس میں جسمانی اذیت ہو یا تذلیل ہو اور کسی شخص کو ایسی سزا نہیں دی جائے گی جس میں جسمانی تشدد ہو اور اس کی تذلیل ہو

آیئے اس دفعہ کے مضمرات پر غور کریں اسلام میں سزاؤں کا نظام تین حصوں میں ہے۔

1. قصاص
2. حدود
3. تعزیرات

قصاص کے بارے میں قرآن مجید میں ہے۔

انَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ **(المائدہ)**

اس میں جسمانی تشدد بھی ہے تذلیل بھی ہے حدود کی سزاؤں میں رجم کی سزا ہے اب رجم تو نام ہی تشدد کا ہے ہاتھ اور پاؤں کاٹنے کی سزاؤں میں بھی تشدد ہے تعزیرات میں کوڑے مارنے کی سزائیں ہیں ان میں بھی تشدد ہے اور پھر

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (النور) کا حکم بھی ہے تو برسر عام سزا دینے میں تذلیل بھی ہے یعنی اسلامی سزاؤں کا کوئی شعبہ ایسا نہیں بچتا جو اقوام متحدہ کے چارٹر کی زد میں نہ آتا ہو اخبارات میں تو یہ جملے اکثر آپ حضرات پڑھتے ہوں گے کہ یہ غیر انسانی ظالمانہ اور وحشیانہ

سزائیں ہیں ان جملوں کے پیچھے دراصل یہ دفعہ بول رہی ہوتی ہے کچھ عرصہ پہلے اقوام متحدہ کی جنزل اسمبلی میں ایک قرارداد منظور ہوئی کہ موت کی سزا کسی جرم میں نہ دی جائے اس دفعہ میں گویا انہوں نے اسلام کی سزاؤں کے سارے نظام کو لپیٹ دیا ہے ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان کی باتوں کو سمجھ بھی نہیں پاتے اور وہ اپنا سارا کام کر گذرتے ہیں ہم سے مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ جب آپ نے بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کر رکھے ہیں کہ ہم کسی شخص کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کریں گے اور کسی شخص ایسی سزا نہیں دیں گے تو پھر آپ ایسی سزائیں کیوں نافذ کرتے ہیں ہم پہلے واضح کو کر چکے ہیں کہ ہمیں بین الاقوامی معاہدات سے انکار نہیں لیکن ہمارے ہاں ایک حد فاصل ہے کہ ہم نصوص صریحہ اور احکام قطعیہ کے حوالے سے نہ عالمی عرف کو مانتے ہیں اور نہ معاہدات کو مانتے ہیں اس سے ہٹ کر ہر معاملے میں عرف کو بھی مان سکتے ہیں اور معاہدات کو بھی قبول کر سکتے ہیں غلامی کے معاملے میں ہم نے عرف کو قبول کر لیا ہے کیونکہ وہ منصوصات میں سے نہیں ہے لیکن قصاص، حدود اور تعزیرات کے معاملے میں ہم عرف کو قبول نہیں کرتے کیونکہ یہ احکام قطعیہ ہیں عرف یا معاہدہ قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ان میں ہمارے لئے کوئی اگر ہم اس دفعہ کو من و عن عمل اور عقیدہ و اصول کے اعتبار سے قبول کر لیں تو ہمیں قرآن پاک کی بہت سی آیات اور ذخیرہ احادیث میں بہت سی احادیث سے دستبردار ہونا پڑے گا اور اس دستبرداری کی ہمارے دین و مذہب میں نہ اجازت و گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت ہے

اور دوسری بات یہ ہے کہ ان سزاؤں کو یہ انسانیت کی تذلیل سمجھتے ہیں اول بات یہ ہے کہ یہ سزائیں مسلمانوں نے اپنی طرف سے نہیں نافذ کی ہیں بلکہ ان کو نافذ کرنے کا حکم رحمن و رحیم مہربان ذات نے دیا ہے جس نے خود اس انسان کو بنایا ہے اسے پتا ہے کہ انسان کی عزت

و ذلت کا معیار کیا ہے کون سا انسان عزت کا حقدار ہے اور کون ذلت کا پھر ہمارا سوال یہ ہے کہ جس انسان کو قتل کیا گیا کیا اس کی بھی کوئی عزت تھی یا نہیں جس عورت کے ساتھ زنا کیا گیا کیا اس کی اس کے خاندان کی کوئی عزت نہیں تھی یا وہ انسان نہیں اگر وہ انسان ہیں اور یقیناً ہیں تو یہ کون سا انصاف ہے کہ قاتل اور زانی تو ایک انسان بلکہ پورے خاندان کی عزت کو تار تار کر دے مقتول کے ورثاء روتے رہیں اور قاتل کو کھلی چھوٹ دے دی جائے عورت بیچاری معاشرے میں منہ چھپائے پھرے اس کا خاندان عزت کی وجہ سے چھپتا پھرے اور زانی دندناتا رہے کیا مجرم اور غیر مجرم میں کوئی فرق بھی ہے یا وجہ یہی ہے کہ ہم نے آج کی دنیا میں جرائم کی شرح بڑھنے کی بنیادی اور بڑی احکام الحاکمین کے فیصلوں کو ماننا اور ان پر عمل کرنا تو دور رہا ان پر انگلیاں اٹھانا شروع کر دی ہیں گویا عقل عطا کرنے والے پر نعوذ باللہ بے وقوف ہونے کے طعنے کسنے شروع کر دیے ہیں کہ ہم انسانیت کے تمہارے خدا سے زیادہ خیرخواہ نہیں ہیں بس ہم اس بے وقوف قوم کے لئے ہدایت کی دعا ہی کر سکتے ہیں۔

دفعہ نمبر 16 خاندانی نظام

1۔ اس دفعہ کی تین شقیں ہیں بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل ، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے مردوں اور عورتوں کو نکاح ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابری کے حقوق حاصل ہیں۔

2۔ نکاح فریقین کی پوری اور آزاد رضا مندی سے ہو گا۔

3۔ خاندان معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے

اس دفعہ پر تبصرہ کرنے سے پہلے قانون کی دنیا میں چند اصطلاحات ہیں وہ سمجھ لیں تاکہ اس پر کیا گیا تبصرہ سمجھنا آسان ہو جائے مثلاً

- فوجداری قانون
- دیوانی قانون
- عائلی قانون

فوجداری قانون لڑائی جھگڑوں کے متعلق ہوتے ہیں ایسے قوانین میں حکومت فریق ہوتی ہے کیونکہ ان معاملات کا تعلق امن عامہ سے ہوتا ہے ایسے معاملات میں حکومت کسی کو بغیر اطلاع یا شکایت پکڑ سکتی ہے۔

دیوانی قوانین وہ ہوتے ہیں جن میں آپس کی شکایات پر مقدمات درج ہوتے ہیں ان میں اجتماعی امن عامہ تو زد میں نہیں آتا لیکن لوگوں کے باہمی معاملات کا مسئلہ در پیش ہوتا ہے جیسے ایک شخص کو کسی دوسرے شخص سے شکایت ہے کہ اس نے مجھ سے فلاں زیادتی یا نا انصافی کی ہے ایسے معاملات میں حکومت کا خود سے کوئی دردسر نہیں ہوتا آپ کے ساتھ کسی نے نا انصافی یا ظلم کیا ہے تو آپ کو خود شکایت کرنا ہو گی آپ شکایت نہیں کریں گے تو حکومت آپ کے معاملے میں خود سے کوئی دخل اندازی نہیں کرے گی پبلک لاء ، پرسنل لاء کی اصطلاحات بھی ہمارے ہاں استعمال ہوتی ہے پرسنل لاء کہتے ہیں خاندانی نظام کو اس کو القوانین الشخصیہ، شخصی قوانین، عائلی قوانین وغیرہ بھی کہتے ہیں نکاح طلاق وراثت حضانت کفالت وغیرہ سب اسی کے تحت کے آتے ہیں اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں کو ان کے پرسنل لاء پر عمل کا حق حاصل ہے

اور وہ اکثر و بیشتر مطالبات بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ اقلیتوں کو ان کے پرسنل لاء کے مطابق معاملات طے کرنے کا حق دیا جائے لیکن جب یہی حق ہم مسلمان ان سے مانگتے ہیں تو اپنے ملکوں میں ہمیں یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں یہ مغرب کا دوہرا معیار ہے جس کو ہمارے لوگ نہیں سمجھ پا رہے اب آتے ہیں دفعہ نمبر 16 کے اوپر تبصرہ کی طرف تبصرہ پہلی بات تو یہ ہے کہ قانون یہ تسلیم کرتا ہے کہ نکاح صرف بالغ مرد اور عورت کا تصور کیا جائے ے گا صغیر اور صغیرہ کے نکاح کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہمارے ملک میں بھی یہی قانون ہے کہ لڑکی کی عمر 16 سال اور لڑکے کی عمر 18 سال مقرر ہے لیکن نکاح کے علاوہ جو کچھ بھی ہو اسے قانون درست تسلیم کرتا ہے یہ شق دوسری بات یہ کہتی ہے کہ ہر بالغ مرد اور عورت کو آپس میں شادی کا حق حاصل ہے بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت یا مذہب کے نام پر لگائی جائے کوئی امریکی آسٹریلیا کی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کوئی پابندی نہیں ہے کوئی چینی کسی روسی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے کوئی کالا کسی گوری سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے حتیٰ کہ کوئی مسلمان کسی ہندو سکھ عیسائی یہودی سے نکاح کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے مذہب ، نسل، قومیت ان تینوں میں سے کسی کی بنیاد پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے ان تینوں میں سے دو کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نسل یا قومیت کی بنیاد پر نکاح میں ہمارے ہاں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے لیکن ہم مذہب کا فرق مانتے ہیں مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی اور مسلمان مرد کسی مشرکہ دہریہ ملحدہ عورت سے نکاح نہیں کر سکتا اللہ پاک کا ارشاد ہے۔

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ اوروَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ (البقرہ)

یہ نص قطعی اور نص صریح ہے چنانچہ ہمارے ہاں مذہب کی بنیاد پر نکاح کی جو پابندی ہے آج کی دنیا کے لیے یہ ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے اس پر بڑے تنازعات ہوتے ہیں مسلمانوں پر اعتراض ہے کہ باقی سارے مذاہب کے لوگ آپس میں شادیاں کرتے ہیں تم لوگ الگ کیوں ہو؟ اس بنیاد پر مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ تم قومی برادری میں ایڈجسٹ نہیں ہو رہے نہ رشتہ لیتے ہو نہ رشتہ دیتے ہو۔

اگر ہم اقوام متحدہ کے چارٹر کی اس دفعہ 16 کو عقیدہ اور اصول کے طور پر قبول کر لیں تو قرآن و سنت کی نص صریح اور نص قطعی متاثر ہوتے ہیں گویا ہم سے چارٹر کی اس شق پر عمل کروا کر خدا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن چھڑوانا چاہتے ہیں یعنی جس طرح وہ خدا کے باغی بن چکے ہیں ہمیں بھی خدا و نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا باغی بنانا چاہتے ہیں جس کی اجازت ہمیں ہمارا مذہب تو دیتا ہی نہیں ہے اور ہمیں اپنی عفت مآب پاکدامن پاکیزہ بہنوں بیٹیوں کو کافروں کے بستر پر بھیجنے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے اب پہلی شق کی تیسری بات پر نظر ڈالتے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو نکاح ازدواجی زندگی قائم کرنے اور فسخ کرنے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں اگر ہم مسلمان دفعہ نمبر 16 کی اس شق کو قبول کر لیں تو ولایت خواہ اجباری ہو یا غیر اجباری اسی طرح کفاءت و غیرہ کے احکامات سب ختم ہو جاتے ہیں۔

میاں بیوی کے درمیان اختیارات کا توازن

زیر بحث دفعہ نمبر 16 کا اگلا جملہ ازدواجی زندگی کے دوران میاں بیوی کے حقوق و اختیارات سے متعلق ہے اسلام کا واضح قانون ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْؕ (النساء)

اس کا اولین مصداق خاندان ہے عمومی مصداق میں حکومت مرا اولین مصداق یہی ہے کہ مرد گھر کا حاکم ہے مراد لی جاتی ہے ہے لیکن۔

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ)

گھر کے نظم کا حکمران مرد ہے اس کی دو وجوہات بھی قرآن کریم نے بیان فرمائی ہیں۔

1۔ اللہ پاک نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے اس سے اس دنیا کی فضیلت مراد ہے کہ اللہ پاک نے مرد کی عقلی و جسمانی ساخت ایسی بنائی ہے کہ وہ عورت کی عقلی و جسمانی ساخت پر حاوی ہے مرد میں فعالیت ہے عورت میں انفعالیت ہے۔

2۔ مرد عورت پر مال خرچ کرتا ہے اب یہ مال خرچ کرنے والی بات مغربی ممالک میں تو نہیں ہے کیونکہ وہاں مرد بھی کماتا ہے عورت بھی کماتی ہے لیکن اسلام ایک جامع خاندانی نظام پیش کرتا ہے جس میں مرد کے ذمہ گھر کے باہر کی ذمہ داریاں ہیں اور عورت کے ذمہ گھر کے اندر کی ذمہ داریاں ہیں اس سے ایک متوازن معاشرہ تشکیل پاتا ہے اب آپ مغرب کی طرف دیکھ لیں کہ وہاں عورت گھر سے باہر نکل کر پیسے تو کما لیتی ہے لیکن مجموعی طور پر معاشرہ خاندانی اقدار اور ان کی افادیت سے تہی دامن ہے چنانچہ اسلام میں گھر کا حاکم مرد ہے عورت حاکم تو نہیں ہے۔لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر ایک منتظم ضرور ہے جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

والمرأةُ راعيةٌ على بيتِ بَعْلِها وولدِه وهي مسؤولةٌ عنهم (بخاری)

لیکن بالاتری مرد کو حاصل ہے اس کی حکمت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی نظام چھوٹا ہو یا بڑا اس میں فائنل اتھارٹی ایک ہاتھ میں ہو گی تو نظام چلتا ہے دو ہاتھوں میں یکساں ہو تو نظام نہیں چلتا ایک ملک کے دو صدر ہوں یا ایک کمپنی میں یکساں اختیار رکھنے والے دو پریزنڈس ہوں تو نظام نہیں چل سکتا یہ فطرت کے خلاف ہے کائنات کا نظام ہزار ہا برس سے صحیح کیوں چل رہا ہے اس لیے اس کا کنٹرول ایک ہاتھ میں ہے قرآن کریم کہتا ہے۔

لَوْ كانَ فِيهِما آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتا (الانبیاء)

یعنی اگر اختیارات کسی اور کے پاس بھی ہوتے تو بیڑہ غرق ہو جاتا۔

إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (المؤمنون)

ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کے ساتھ الگ کھڑا ہوتا ہر وقت جھگڑے ہی ہوتے رہتے۔

توحید کا فلسفہ یہی ہے کہ ایک ہی اللہ ہے جو ہر چیز کا حاکم اور مالک ہے کسی بھی ادارے کا کسی بھی کمپنی کا نظام اس وقت صحیح چلتا ہے جب اس کی فائنل اتھارٹی ایک ہاتھ میں ہو گی گھر بھی ایک نظام ہے اس کی فائنل اتھارٹی بھی ایک ہاتھ میں ہو گی تو نظام چلے گا دو ہاتھوں میں ہو گی تو بیڑہ غرق ہو جائے گا جیسے کہ مغرب کے خاندانی نظام کا ہو چکا ہے آج مغرب سر پکڑے بیٹھا ہے کہ فیملی سسٹم کدھر گیا۔

مغرب کا خاندانی نظام

مغرب کی صورت حال یہ ہے کہ چچا، پھوپھی، خالہ کے رشتے گم ہو گئے ہیں والدین کے رشتے بھی بڑی مشکل سے ملتے ہیں باپ بھی اولڈ ہوم میں ماں بھی اولڈ ہوم میں میاں بیوی کی

آپس کی لڑائیوں کے نتیجے میں وہاں شادی کے قوانین ایسے سخت ہیں کہ لوگ شادی کرنا ہی گوارہ نہیں کرتے بغیر شادی کے اکھٹے رہتے ہیں کسی جوڑے کی سال دو سال ساتھ رہنے کے بعد انڈر سٹینڈنگ ہو گئی تو شادی ہو جائے گی ورنہ کسی نئے ساتھی کی تلاش میں الگ ہو جائیں گے کسی جوڑے کی شادی سال دو سال چل جائے تو اسے بڑی کامیاب شادی تسلیم کیا جاتا ہے بچے پیدا کرنا تو ان کی ترجیحات میں کوئی چوتھی پانچویں نمبر کی ترجیح ہوتی ہے بچوں پر کیریئر کو ترجیح دی جاتی ہے اگر کسی جوڑے کو شوق آ ہی گیا بچے کا تو ماں کے پاس بچے کے لیے وقت نہیں ہے اس نے تو اپنے کام پر جانا ہے اس صورت میں ماں اپنے کام پر جاتے ہوئے اپنے بچے کو بے بی سٹنگ کے لیے کسی ڈے کیئر سنٹر کے حوالے کر جاتی ہے ایسے سنٹرز کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معقول معاوضہ کے عوض ماؤں کی غیر موجودگی میں ان کے بچوں کا خیال رکھتے ہیں ان کے ہاں یہ کام کرنے والی بھی خواتین ہوتی ہیں جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں اب ماں کسی اور کے لئے کام کر رہی ہے اور اس کے بچے کی دیکھ بھال کے لئے کوئی عورت اس کے لیے کام کر رہی ہے میاں اپنے کام پر بیوی اپنے کام پر بچوں کے لیے تو وقت ہی نہیں ہوتا پھر جب دونوں کماتے الگ الگ ہیں تو خرچ بھی اپنا اپنا کرتے ہیں گھر کے خرچے میں دونوں شریک ہوتے ہیں آخر میں تصویر یہی سامنے آتی ہے کہ دونوں نے اپنی جسمانی ضرورت کے لئے سمجھوتہ کیا ہوا ہے اور بس اکثریت تو اس بات کو گوارہ بھی نہیں کرتی کہ جسمانی ضرورت کے لئے کسی ایک ساتھی کو مستقل چمٹائے رکھو یہ مجموعی صورتحال ہے ہمارے ہاں بچے کی پہچان کے لیے باپ کا نام لکھتے ہیں مغرب میں مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اکثر یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ فلاں شخص کا باپ کون ہے جب باپ کا پتہ نہیں ہو گا تو چچا، پھوپھی کزن کہاں سے آئیں گے اس لیے مغرب میں بچے کی پہچان ماں کے نام سے کی جاتی ہے اسے سنگل پیرنٹ کا قانون کہتے ہیں

ہمارے ہاں بھی ایک این جی او نے مطالبہ کیا کہ یہ قانون ہمارے ہاں بھی نافذ کیا جائے تو ہم ان کو کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں تو ہزار میں سے نو سو ننانوے لوگوں کو اپنے باپ کا پتہ ہوتا ہے ہمیں کوئی ایسی دقت پیش نہیں آتی جس کے لیے یہ قانون نافذ کیا جائے۔

دفعہ نمبر 18

ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر آزادی مذہب کا پورا حق ہے اس حق میں یا عقیدے کو تبدیل کرنے، پبلک یا نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ عمل عبادت اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے، علم اور خیالات کی تلاش کرے انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے ۔

تبصرہ

یہ آزادی رائے اور آزادی مذہب کا حق کہلاتا ہے اس پر بھی ہم سے ان لوگوں کا بہت لمبا تنازعہ ہے مثلاً کیا ہم اپنے ملک میں قرآن کریم کے کسی حکم کے خلاف کسی شخص کو رائے رکھنے کا حق رکھتے ہیں؟ یا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی منفی رائے دینے کا حق دیتے ہیں؟ مذہب کے خلاف کوئی بات کہنے کا حق دیتے ہیں؟ ان لوگوں کے مطابق ہم آزادی رائے کے حق کو مجروح کر رہے ہیں یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی خدا کے خلاف ایک رائے قائم ہو گئی ہے تو آپ کون ہوتے ہیں اسے روکنے والے ؟ قرآن کریم اور رسول اللہ کی

کسی بات پر ایک شخص مطمئن نہیں ہے اس نے اس کے خلاف ایک رائے قائم کر لی ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے یعنی آزادی رائے کا معنی یہ ہے کہ ایک شخص کوئی بھی رائے، کوئی بھی فکر ، کسی بھی قسم کے خیالات قائم کرنے اور پھر ان کی تبلیغ کرنا چاہے تو یہ اس شخص کا حق ہے۔

اس پر ہم اہل مغرب سے سوال کرتے ہیں کہ یہ آزادی اظہار رائے (Absolute) یعنی مطلق ہے اس پر کوئی قید کوئی پابندی کوئی شرط عائد نہیں ہوتی ہے یا یہ کہ آزادی اظہار پر کچھ قیود و شرائط بھی ہونی چاہیں؟ اگر کوئی یہ کہے کہ میری رائے یہ ہے کہ دولت مند افراد نے بہت پیسے کما لیے اور غریب لوگ بھوکے مر رہے ہیں لہذا ان دولت مندوں کے گھروں پر ڈاکہ ڈال کر اور ان کی دوکانوں کو لوٹ کر غریبوں کو پیسہ پہنچانا چاہیے اور دیانت داری کے ساتھ اس کی تبلیغ کرے اس کا اظہار کرے لوگوں کو دعوت دے کہ آؤ میرے ساتھ شامل ہو جاؤ یہ جتنے دولت مند لوگ ہیں روزانہ ان پر ڈاکہ ڈالا کریں گے ان کا مال لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کریں گے تو کیا آپ ایسی اظہار رائے کی آزادی کے حامی ہوں گے یا نہیں؟ اس کی اجازت دیں گے یا نہیں؟ صاف ظاہر ہے اس کی اجازت آپ بھی نہیں دیں گے تو معلوم ہوا کہ آزادی اظہار اتنی Absolute مطلق نہیں ہے کہ اس پر کوئی قید کوئی شرط کوئی رائے اتنی پابندی عائد نہ کی جائے کچھ نہ کچھ تو قید لگانی پڑے گی پھر ہمارا سوال یہ ہے کہ یہ شرط کس بنیاد پر لگائی جائے گی؟ اور لگائے گا کون؟ کس بنیاد پر یہ طے کیا جائے کہ فلاں قسم کی رائے کا اظہار کرنا تو جائز ہے اور فلاں قسم کی رائے کا اظہار کرنا جائز نہیں ہے؟ فلاں قسم کی تبلیغ جائز ہے اور فلاں قسم کی تبلیغ جائز نہیں ہے؟ اس کا تعین کون کرے گا اور کس بنیاد پر کرے گا حقیقت یہ ہے کہ یہ مجمل نعرے کہ صاحب ہیومن رائٹس ہونے چاہئیں، آزادی اظہار ہونی چاہیے، تحریر و تقریر کی آزادی

ہونی چاہیے ان کی ایسی کوئی بنیاد جس پر ساری دنیا متفق ہو سکے یہ کسی کے پاس نہیں ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں کیوں؟ اس واسطے کہ جو بھی یہ بنیادیں طے کرے گا وہ اپنی سوچ اور اپنی عقل کی بنیاد پر کرے گا اور کبھی دو انسانوں کی عقل یکساں نہیں ہوتیں دو گروہوں کی عقلیں یکساں نہیں ہوتیں، دو زمانوں کی عقلیں یکساں نہیں ہوتیں، ان کے درمیان اختلاف رہا ہے اور رہے گا اور اس اختلاف کو ختم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی عقل اپنی ایک لمیٹیشن رکھتی ہے اس کی حدود ہیں اس سے آگے وہ تجاوز نہیں کر پاتی۔

محمد ﷺ کا اس پوری انسانیت کے لیے سب سے بڑا احسان عظیم یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ان تمام معاملات کو طے کرنے کی جو بنیاد فراہم کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ذات جس نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا وہ ذات جس نے انسانوں کو پیدا کیا اسی سے پوچھو کہ کون سے انسانی حقوق قابل تحفظ ہیں اور کون سے انسانی حقوق قابل تحفظ نہیں؟ وہی بتا سکتا ہے اس کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔

تحفظ ناموس رسالت کا مسئلہ

جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے تو یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ یا دیگر انبیاء کرام علیھم السلام یا قرآن کریم یا مذہبی شعائر کی توہین کو جرم قرار دینے اور اس پر سزا مقرر کرنے کا انسانی حقوق کے ساتھ کیا تعلق ہے ؟ کیا اللہ پاک کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ، قرآن کریم یا مذہب کی توہین اب حقوق میں شامل ہو گئی ہے ؟ کل تک تو یہ جرائم میں شمار ہوتی تھیں

اب بھی کسی عام شخص کی توہین کو جرم سمجھا جاتا ہے ملک کے کسی بھی شہری کی توہین قانوناً جرم ہے ہر شخص کو اپنی توہین پر عدالت سے رجوع کا حق حاصل ہے اور قانون اسے تحفظ فراہم کرتا ہے سوال یہ ہے کہ ایک عام شہری کی توہین تو قانوناً جرم ہو کیا نعوذباللہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین جرم نہیں ہے؟ اور اگر ایک عام شہری کی بلاوجہ توہین پر سزا دی جا سکتی ہے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین پر سزا کیوں نہیں دی جا سکتی ؟ دنیا کے ہر ملک کی طرح ہمارے ملک میں ایک قانون موجود ہے جسے ، ، ازالہ حیثیت عرفی کا قانون کہتے ہیں معاشرے کے ہر فرد کی ایک عرفی حیثیت اور ایک اسٹیٹس ہے جس کے تحفظ کا اسے قانوناً حق حاصل ہے کوئی شخص اگر اس کی عرفی حیثیت اور اسٹیٹس کو مجروح کرتا ہے تو اسے حق ہے کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور قانون اس بات کے لیے اسے تحفظ فراہم کرتا ہے ہم تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کو انسانی حقوق کے منافی قرار دینے والوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی حیثیت عرفی تو ہے معاشرے کے ہر فرد کی ہے جسے مجروح کرنے کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے تو کیا نعوذباللہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے جسے مجروح کرنا جرم ہو اور اس پر سزا دی جا سکے؟ آج کوئی شخص کسی پولیس مین کی وردی کی توہین کرے تو یہ جرم ہے کسی فوجی کی وردی کی توہین جرم ہے اور اس کے استار کی توہین جرم ہے قومی پرچم کی توہین جرم ہے قائد اعظم کی توہین جرم ہے قومی علامتوں کی توہین جرم ہے اور ان پر باقاعدہ سزائیں مقرر ہیں تو کیا قرآن کریم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ، اور اسلام کے مذہبی شعائر کی توہین جرم نہیں ہے؟ اور ان پر سزا دینا امتیازی قانون اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کیسے قرار پا جاتا ہے؟ کچھ تو انصاف کرو یہ انصاف کے پیمانے تو برابر رکھو ہم اہل دانش کو سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور کی دعوت دیتے ہیں۔

جیو پولیٹکس اور اسٹریٹجک تبدیلیاں۔

1991 میں جب سوویت یونین ٹوٹ کر بکھر گیا تو صرف امریکہ ہی دنیا کی سب سے بڑی طاقت رہ گیا بنی نوع انسان کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی پوری دنیا پر کسی ایک طاقت کا تسلط قائم نہیں ہوا اس وقت کے عظیم امریکی مفکرین نے اس حاکمیت کو تاریخ کا خاتمہ قرار دیا ان کا خیال تھا کہ اب لبرل امریکی دنیا میں غالب فکر ہو گی اور اس سوچ کو پوری دنیا میں نظام کے طور پر قبول کیا جانا چاہیے امریکہ کو اس وقت عالمی سیاست میں تین بڑے چیلنجز کا سامنا تھا۔

1. روس
2. چین
3. عالم اسلام

امریکہ میں روس کے متعلق عام طور پر یہ نقطہء نظر تھا کہ سوویت یونین کی شکست کے بعد روس میں دوبارہ اٹھنے کی سکت نہیں رہی امریکی مفکرین کا خیال تھا کہ عالمی سیاست میں روس کے پاس دو راستے ہیں۔

1. امریکی قیادت میں بننے والے مغربی بلاک نیٹو کی رکنیت حاصل کر کے یورپی یونین کا حصہ بن جائیں۔
2. مغربی بلاک کا حصہ بننے کی بجائے اپنی مستقل اور مشرقی شناخت برقرار رکھے۔

لیکن اگر وہ اپنی شناخت برقرار رکھنا چاہئے تو اپنی تباہی کے دن گن لیں امریکہ نے ایسی پالیسی بنائی کہ روس کے گرد گھیرا تنگ کیا انہوں نے نیٹو کو مغربی یورپ سے مشرقی یورپ تک پھیلانے کے منصوبے پر کام کیا میں پولینڈ چک ریپبلک اور ہنگری نیٹو کا حصہ بن گئے یہ سلسلہ

جاری رہا 1999 میں ایسٹونیا، لٹویا، اور لیتھوانیا بالٹک ممالک نے نیٹو میں شمولیت اختیار کی 2004 میں جارجیا اور یوکرین نے بھی نیٹو کی سالانہ کانفرنس میں نیٹو کی رکنیت 2008 حاصل کرنے کا اعلان کیا یہ اعلان روس کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی سے 2008 تک کے دورانیے میں روس اس اسٹیج پر پہنچ گیا تھا کہ اپنے دفاع 1991 کے لیے عالمی فورمز پر آواز بلند کرے چنانچہ روس نے اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ یہ آواز بلند کی اس کے ساتھ ہی نیٹو اتحاد کو وسیع کرنے کا منصوبہ بھی خاصا مشکل ہو گیا روس کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم تھا کہ نیٹو کو وسیع کرنے کا منصوبہ انہیں ذبح کرنے کے مترادف ہے لیکن 2008 سے پہلے وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس منصوبے کے خلاف آواز بلند کر سکے یوکرائن میں جاری جنگ کے مسئلے کی بنیاد 2008 کی اسی کانفرنس میں رکھی گئی۔

چین امریکا کے لیے ایک اور خطرہ تھا جسے وہ روکنا چاہتا تھا امریکی مفکرین کا خیال تھا کہ چین کو کچھ عرصے کے لیے معاشی طور پر خوشحال ہونے دیا جائے ان کا خیال تھا کہ چین کی معیشت میں مثبت تبدیلی آنے سے چینی عوام کی زندگی بہتر ہونے لگے گی تو وہ خود چینی حکومت سے مزید مطالبات کریں گے وہ اپنے سیاسی نظریے کی بنیاد پر یقین رکھتے تھے کہ چینی عوام اپنی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور وہاں ایک انقلاب برپا ہو گا یہی انقلاب امریکی ترقی کا سبب بن جائے گا اور وہ چین میں امریکی مفادات کی نگرانی کرنے والی حکومت بنانے کی پوزیشن میں کے لیے راہ ہموار کی بلکہ ہوں گے انہوں نے اس نظریہ کی بنیاد پر نہ صرف چین چین Boeing اور MG Ford چین پر سے پابندیاں بھی ہٹائیں بڑی کمپنیاں جیسے بھیجی گئیں اس نے چین کو منافع کمانے کا موقع فراہم کرتے ہوئے چین کی بڑی منڈیوں میں اپنے منافع کے لیے بھی نیٹ ورک کھول دیا۔

اس عمل کا ایک اور حصہ یہ تھا کہ چین کو تجارتی راستے کھولنے کے لیے بین الاقوامی اقتصادی تنظیموں کا حصہ بننے کی اجازت دی گئی تاکہ انہیں کھل کر تجارتی سرگرمیاں جاری رکھنے کی راہ ہموار ہو چین کے ساتھ یہ تمام احسانات اس نیت کے ساتھ کیے جا رہے تھے کہ چینی عوام زندگی بہتر ہونے کے بعد مطالبات کریں گے جو بالآخر شورش اور انقلاب کی صورت میں اختتام پذیر ہوں گے یہ انقلاب امریکی حکمت عملی کا بہت مقبول حصہ ہیں وہ اسے تاریخی انقلاب کہتے ہیں جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ سب جمہوریت انسانی حقوق اور دیگر بنیادی مسائل کے حل کے لیے برپا کیے جاتے ہیں پھر انہی بظاہر مثبت نعروں کی بنیاد پر امریکہ فنڈنگ بھی کرتا ہے یہ انقلابات روس جارجیا، یوکرین ایران، چین اور کئی دوسرے ممالک میں ناکام ہوئے۔

عرب دنیا میں جمہوریت کے لیے برپا کیے جانے والے انقلابات بھی اسی عمل کا حصہ تھے اسلامی دنیا تیسرا بڑا چیلنج تھا جس پر امریکہ کو قابو پانا تھا اسلامی دنیا میں بہت بڑا امریکی ہدف یہاں کے وسائل، معدنیات، تیل ، گیس اور توانائی کا حصول تھا یہ وسائل امریکہ کے لیے نہایت اہم تھے اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کی وہ حکومتیں جو امریکی حکمرانی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے اپنے منصوبے کے مطابق انہیں زیر کرنے کے منصوبوں پر بھی کام کرتا رہا اس وقت کی امارت اسلامیہ کی حکومت عراق کے صدام حسین اور عرب دنیا کے دوسرے راہنما جو عرب بہار کے انقلاب کے بعد اقتدار سے بے دخل کر دیے گئے ان کو نشانہ بنایا گیا امریکی عسکری قیادت اور سیاسی مفکرین کا خیال تھا کہ یہ جنگ بہت کم وقت میں نتیجہ خیز ثابت ہو کر ختم ہو جائے گی اس کے بعد وہ ان ممالک میں اپنی پسند کی حکومتیں بنائیں گے اور امریکی تسلط برقرار رکھنے کے لیے پیسے اور فوجی اڈوں کے زور پر ان ممالک پر چڑھائی کریں گے لیکن ایسا نہیں تھا عالم اسلام میں بھی امریکہ کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ،افغانستان ،عراق ایران وغیرہ

امریکہ کے خلاف کھڑے ہو گئے امریکہ اسلامی دنیا میں دلدل میں پھنس گیا یوں چین اور روس کو بین الاقوامی سطح پر امریکہ کے مقابلے کا موقع فراہم ہو گیا 2018 میں پہلی بار پینٹاگون نے ایک نئی حکمت عملی کے ساتھ اعلان کیا کہ روس اور چین عالمی سیاست میں ان کے لیے کسی بھی چیز سے زیادہ اہم ہیں اور وہ اپنی افغان جنگ کو مزید طول نہیں دینا چاہتے آج بیس سال سے زائد ہو گئے ہیں مگر امریکہ کے لیے اب بھی وہی تین چیلنج ہیں۔

- روس
- چین
- عالم اسلام

یعنی اجتماعی مفاد کے لیے مسلم ممالک میں نمو پذیر ہونے والی وحدت و یگانگت کی فکر اس فکر کو مسلم دنیا کے بعض ممالک بڑے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں یوکرین کی جنگ کے بعد دنیا کی جغرافیائی سیاسی اور تزویراتی مساواتیں بدل رہی ہیں یہ بدلتی مساواتیں کیا رخ اختیار کر رہی ہیں اور مستقبل میں ان کی کیا حیثیت ہو گی اس حوالے سے چند نکات کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

1۔ دنیا اس وقت ایک محوری سے کثیر محوری میں تبدیل ہو رہی ہے یہ حقیقت کہ امریکہ اور نیٹو یوکرین میں فوج بھیجئے اور یوکرین کو روسی جارحیت سے ے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ امریکہ اور نیٹو کے پاس اب کسی بھی صورت میں عالمی سیاست میں ویٹو پاور نہیں رہا چین اور روس نئے ورلڈ آرڈر میں بڑے کھلاڑی ہیں۔

2۔ اب چین اور روس دونوں اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ امریکہ کے خلاف اپنے بلاک کو کیسے مضبوط کیا جائے اب تک امریکہ یہ سمجھتا رہا ہے کہ چین اور امریکہ کے درمیان نئی سرد

جنگ میں روس کو راضی رکھ کر نئ عالمی صف بندی میں روس امریکہ کا ساتھ دے گا جون 2021 میں پیوٹن اور جو بائیڈن کے درمیان ملاقات اس خیال سے کی گئی تھی کہ امریکہ کو روس کے ساتھ تعاون کے لیے مشترکہ بنیاد تلاش کرنی چاہیے مگر یہ امکان بعید تر ہوتا جا رہا ہے کہ روس عالمی سطح پر امریکی بلاک کا حصہ بن جائے۔

3۔ روس Greater Eurasian partnership (GEP) پر کام کر رہا ہے اس حکمت عملی کا مفہوم یہ ہے کہ روس مغرب کی بجائے چین بھارت پاکستان اور ایران کے ساتھ تعاون بڑھانے کی کوشش کرے گا اس کا سب سے بڑا ثبوت 3 مارچ 2023 کو اقوام متحدہ میں روسی حملے کے خلاف مذکورہ ممالک کے ووٹ کا استعمال تھا مذکورہ بالا تمام ممالک نے روس کے حملے کے خلاف غیر جانبداری کا ووٹ دیا عالمی سیاست میں چین کے خلاف امریکہ کے کٹر اتحادی بھارت نے روس کے خلاف ووٹ نہیں دیا یہ بھی روس اور بھارت کے تعلقات کی گہرائی کو واضح کرتا ہے روس کے ساتھ ساتھ چین بھی اسی حکمت عملی پر کام کر رہا ہے

4۔ چین خود کو خطے میں ایک مضبوط طاقت بنانا چاہتا ہے اور یہ خطے کے تمام ممالک کے ساتھ تعاون کے بغیر ممکن نہیں چین اس حوالے سے پاکستان کا اسٹریٹجک اتحادی ہے ہیں کہ پیوٹن کے بقول روس اور چین کے روس کے ساتھ نئے تعلقات اس قدر مضبوط تعلقات تاریخ میں کبھی اس حد تک مضبوط نہیں ہوئے روس اور چین کے تعلقات اقتصادی نوعیت کے ہیں اسی لیے دونوں کے درمیان تصادم کا امکان کم ہے بھارت کے ساتھ اختلافات کے خاتمے کے لیے چین نے طویل عرصے سے امن عمل کا آغاز کیا ہے اس حوالے سے دونوں ممالک کے راہنما متعدد بار ملاقات بھی کر چکے ہیں دونوں ممالک کے تعلقات کو اس مقام تک پہنچنے میں کچھ وقت لگے گا

جہاں وہ ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکیں چین کا ایران کے ساتھ پچیس سالہ اسٹریٹجک معاہدے پر دستخط اسی پروگرام کا حصہ تھا۔

5۔ مشرقی بلاک کی قیادت کے لیے روس کچھ عرصے تک اس حکمت عملی پر کام کرتا رہے گا لیکن روس کے لیے اس مقام تک پہنچنا ممکن نظر نہیں آتا جہاں وہ ایک نئے مشرقی بلاک کی قیادت کر سکے کیونکہ اقتصادی طور پر روس کی ایسی تیاری نہیں ہے اس لیے چین مستقبل میں امریکہ کے خلاف بلاک کی قیادت کر سکتا ہے یہ کہ ہندوستان اس بلاک کا حصہ رہے گا یا نہیں البتہ روس سمیت کئی وقت ہی بتائے : بتائے گا دوسرے ممالک کے اس بلاک میں شامل ہونے کا امکان ہے۔

6۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مذکورہ تمام ممالک شنگھائی تعاون تنظیم کے رکن ہیں لہذا مستقبل میں شنگھائی کانفرنس دنیا کی طاقتور اور با اثر اداروں میں سے ایک بن سکتی ہے۔

زہر کا تریاق

(اسلام کی امامت) مراد وہ قوت و قابلیت ہے جس سے کوئی مسلمان یا جماعت دنیا کی راہنمائی و پیشوائی کر سکے ایک بڑی نازک اور وسیع صفات کو چاہتی ہے جو فرد یا جماعت اس منصب پر فائز ہو اس کے لیے ذاتی اصلاح و تقویٰ اور عدل کے علاوہ جہاد اور اجتہاد کی قابلیت کی بھی ضرورت ہے یہ دو لفظ بہت سادہ اور ہلکے ہیں لیکن معانی و مطالب سے لبریز۔

جہاد سے مراد ہے ان تمام نفسی و آفاقی داخلی و خارجی آلہہ و معبودان باطلہ کے خلاف جو اللہ پاک کی فرمانبرداری اور اخلاص میں حریف و رقیب ہوں اپنی انتہائی طاقت اور وسائل صرف

کر دینا تاکہ خدا کے اس قانون کا نفاذ ہو جو انبیاء لیکر آئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ جہاد کر رہا ہے اور کفر و جاہلیت کے بارے میں جس کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے اس کو گہری واقفیت ہو تاکہ جس لباس اور جس رنگ میں بھی ظاہر ہو اس کو پہچان لے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا جس نے اسلام میں نشوونما پایا اور جاہلیت کو وہ نہیں پہچانتا، یقینا ہر مسلمان کے لئے ضروری یہ نہیں کہ وہ کفر و جاہلیت سے گہری اور تفصیلی واقفیت رکھتا ہو اور اس کے مظاہرے اور صورتوں اور رنگوں کو پہچانتا ہو لیکن بلاشبہ اسلام کی راہنمائی اور کفر و جاہلیت کے خلاف اسلامی لشکر کی قیادت کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عام اور متوسط مسلمانوں سے زیادہ کفر و جاہلیت کو پہچانتا ہو اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ اس منصب پر فائز ہوں ان کی تیاری پوری اور ان کی قوت مکمل ہو ان کے پاس لوہے کو کاٹنے کے لیے لوہا بلکہ فولاد ہو وہ کفر کا مقابلہ ان تمام وسائل اور سامان سے کریں جو ان کی دسترس میں ہو جس کا انسان اکتشاف کر سکا ہو اور جہاں تک انسان کے علم کی رسائی ہو اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللهِ وَ عَدُوَّكُمْ

اجتہاد سے ہماری مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیادت و امامت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نئے پیش آنے والے مسائل زندگی میں انفرادا یا اجتماعا صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت اور استعداد رکھتے ہوں اور روح اسلام اور اسلامی قانون سازی کے اصول سے اتنی واقفیت اور مسائل کے استنباط کی قوت رکھتے ہوں جس سے وہ امت کی مشکلات کو حل کر سکیں اور اشتباہ اور تحیر کے موقع پر اس کی رہنمائی کر سکیں نیز وہ اتنی ذکاوت و مستعدی اور علم رکھتے ہوں اور محنت

کرنے کے لیے تیار ہوں کہ اللہ تعالی نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں اور زمین میں دولت و قوت کے جو چشمے اور دفینے رکھ دیے ہیں ان سے کام لے سکیں اور ان کو اسلام کے مقاصد کے لیے مفید بنائیں بجائے اس کے کہ اہل باطل ان کو اپنی خواہشات کے حصول کے لیے استعمال کریں اور زمین میں سر بلندی اور فساد کے لیے ان سے مدد لیں اہل حق ان سے وہ کام لیں جن کے لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے

خدا طلبی کی بجائے اب یہ دنیا طلبی کا دور ہے آج کا غالب نظریہ صرف پیٹ اور جیب ہے اس اصول پر کے طویل سفروں میں ، صبح شام کی سیر میں، چائے اور کھانے کی میز پر پارک اور سیر گاہوں کے سبزہ اور نشستوں پر ، احباب ورفقاء کی بے تکلف گفتگو کے موقع پر کان لگا کر سنیے کیا موضوع ہے تنخواہوں کی کمی بیشی ، افسروں کی رضامندی و ناراض مندی حکام کا تبادلہ اور ان کے مزاج و معاملہ پر تنقید، تجارتوں کا منافہ ٹھیکوں کے احکامات، بینکوں کے حسابات، شرح سود ، کمپنیوں کے حصص انشورنس کمپنی پالیسی ، پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ، خوش قسمتوں پر رشک بد قسمتوں پر تعصب اور اسی قبیل کی باتوں کے سوا آپ کوشش کے باوجود بھی کوئی موضوع گفتگو نہیں پائیں گے یا پھر سیاسی حالات پر تبصرہ لیکن کسی اخلاقی نقطہ نظر سے نہیں کسی نظام فاسد پر اخلاقی تنقید اور کسی نظام صالح کی تمنا کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

اس صورتحال کو کوئی فوجی طاقت کوئی تعزیر اور سزا اور کوئی احتساب و نگرانی روک نہیں سکتی اور نہ اخباری اور ریڈیائی پروپیگنڈہ ، مال و دولت کے ذریعے قلب و ضمیر کی خریداری، سفارتوں کی پر تکلف اور شاندار تقریبات ، اہل دین کو خوش کرنے کے لیے کچھ منصوبے، بین الاقوامی اسلامی کانفرنسیں اور سیمینار جن سے ان ملکوں کی اسلام سے دلچسپی کا وقتاً فوقتاً اعلان کیا جاتا ہے محدود ادارے اور دینی مظاہر اس انقلاب اور بغاوت کا راستہ نہیں روک سکتے ہیں۔

اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ حقائق اور واقعات کا جرات و دور اندیشی اور صحیح دینی روحوں اور دینی بصیرت کے ساتھ سامنا کیا جائے اور ملک میں دین کی صحیح تعلیم کے مطابق ہمہ گیر صالح اور ضروری تبدیلی کے لیے صدق دل اور اخلاص کے ساتھ کوشش شروع کی جائے جن چیزوں کا ازالہ اور سد باب ضروری ہے ان کا سد باب کیا جائے جن اصلاحات کے نفاذ اور جن سکیموں کا آغاز ضروری ہو ان کے آغاز میں دیر نہ کی جائے اسلام قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اور اسلامی حدود کے مطابق معاشرہ میں مساوات اور انصاف قائم کیا جائے اہل ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لیے ضروری قدم اٹھائے جائیں کم از کم جمہور کے ہر فرد کے لیے امکانی حد تک ضروریات زندگی کا بندوبست ہو اس بے جا اسراف اور حد سے بڑھی ہوئی فضول خرچی کو ختم کیا جائے جو عوام کی حقیقی ضروریات بھی پوری ہونے نہیں دیتی اغنیاء واہل ثروت میں ایثار کا مادہ اور ضروریات سے فاضل مال کے خرچ کا جذبہ اور ویسئلونک ماذا ینفقون پر عمل کرنے کا شوق ہو اور فقراء میں استغنا ، خودداری اور اپنے گاڑھے پسینے اور محنت و قابلیت سے اپنی ضروریات زندگی کے بندوبست کا جذبہ ہو نظام تعلیم کو نئے سرے سے اس طرح ڈھالا جائے کہ وہ اسلام کے عقائد و اصول اور عصر جدید کے تغیرات اور علوم وسائل دونوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور دونوں کے تقاضے پورے کرتا ہو اور نئ نسل میں ایک طرف ایمان و یقین اخلاقی قوت استقامت ، خود اعتمادی و خودداری ، اپنے دین پر غیر متزلزل یقین ، اور اس کے لیے قربانی کا جذبہ دوسری طرف قوت ایجاد ، فکری، استقلال بلند ہمتی اور اولوالعزمی پیدا کرے اور جرات و ذہانت کے ساتھ مغرب کا مقابلہ کرنے کا جوہر اور اوصاف پیدا کر سکیں۔

اس انتشار اور بغاوت سے بچنے کے لیے عوام میں دینی روح ، طاقتور ایمان ، اخلاقی حس اور اسلامی شعور پیدا کرنا ہو گا وگا اس ا ذہنی انتشار اور بے دلی ا اور بغاوت کے جراثیم کا خاتمہ کرنے کے لیے ان کے اسباب و محرکات کا مکمل ازالہ ، حالات کی عمومی اصلاح اور سیرت و کردار میں تبدیلی کی ضرورت ہے مغرب سے وہ لینا ہو گا جو اسلامی ممالک اور معاشرہ کے لیے مفید اور اس کے عقیدہ سے ہم آہنگ ہو اور بجائے خود کوئی عملی اور ایجابی افادیت رکھتا ہے اور قوم اور ملک کو مضبوط کر سکتا ہے اور زندگی کی جدوجہد سرفروشی اور دعوت الی اللہ کے مقصد میں مفید ہو سکتا ہے اسلامی مشرق میں قیام امن کے لیے اور مسلمان قوم کو اپنے عقیدہ اور اسلامی زندگی پر قائم رکھنے کے لیے آج کوئی اور دوسرا راستہ نہیں ہے زیادہ ٹھوس علمی تعبیر میں عالم اسلام دراصل ایک ایسی ترقی پذیر عادلانہ سوسائٹی کی تشکیل کی ضرورت ہے جس میں اسلامی طریقہ زندگی کو اپنے عملی و ثقافتی اظہار اور نمود کا پورا موقع مل سکے اس کا علاج خواہ وہ کتنا ہی مشکل اور کتنا ہی دیر طلب ہو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے اس کو مسلمان اقوام کے عقائد و مسلمات اور مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اس کے تمام علوم اور مضامین سے مادہ پرستی ، خدا بیزاری ، اخلاقی و روحانی اقدار سے بغاوت اور جسم پرستی کی روح نکال کر اس میں خدا پرستی ، خدا طلبی ، آخرت کوشی تقوی شعاری اور انسانیت کی روح پیدا کی جائے زبان اور ادب سے لے کر فلسفہ و نفسیات تک اور علوم عمرانی سے لے کر معاشیات و سیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالا جائے مغرب کی ذہنی تسلط کو دور کیا جائے اس کی معصومیت و امامت کا انکار کیا جائے اس کے علوم و نظریات کو آزادانہ تنقید اور جرات مند تشریح یعنی پوسٹ مارٹم کا موضوع قرار دیا جائے۔

مغرب کی سیادت و بالاتری سے عالم انسانی کو جو عظیم الشان نقصانات پہنچے ہیں ان کی نشاندہی کی جائے غرض مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے علوم و فنون کو پڑھا جائے اور اس کے علوم و تجارب کو مواد خام یعنی را متیریل فرض کر کے اپنی ضرورت اور اپنے قد و قامت اور اپنے عقیدہ و معاشرت کے مطابق سامان تیار کیا اس عظیم کام میں کتنی ہی مشکلات ہوں اور اس میں خواہ کتنی دیر لگے عالم اسلام میں تجدد و مغربیت کی اس عالمگیر رو کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں جو اسلام کے وجود ملی اور اس کے اجتماعی ڈھانچہ کو چیلنج کر رہی ہے اور اس کے لیے شدید خطرہ بلکہ موت و حیات کا مسئلہ بن گئی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان عوام کا خلوص ان کی قربانیاں ان کا جذبہ اور ان کی قوت عمل جس کے سر ان ملکوں کی آزادی اور سلطنتوں کے قیام کا سہرا ہے اس روشن خیالی و تجدد کی آگ کا حقیر ایندھن بن کر رہ گئی ہے اور یہ سادہ دل بے زبان گرم جوش ، اور مخلص عوام ان قائدین اور حکمرانوں کے ہاتھ میں بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ بن کر رہ گئے ہیں جن کو جس منزل کی طرف چاہا جاتا ہے خاموشی کے ساتھ ہنکایا جاتا ہے اسلامی ممالک کے رخ کی تبدیلی اور اسلامی فکر اور اسلامی زندگی کی طرف ان کو لے چلنے کی تدبیر یہی ہے کہ اس طبقہ کی اسلامی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے جس کے ہاتھ میں ملک کی راہنمائی اور اس کی زمام کار آنے والی ہے اور اس نظام تعلیم کو درست کیا جائے جو اس طبقہ کو تیار کرتا ہے۔

نظام تعلیم کی بنیادی تبدیلی اور اس کی اسلامی تشکیل اگرچہ نہایت ضروری ہے. مگر دیر طلب اور طویل کام ہے اور اس کے لیے وسیع عظیم صلاحیتوں اور وسائل کی ضرورت ہے جدید اسلامی نسل کا معاملہ ایک دن کی تاخیر اور التواء کا روادار نہیں مندرجہ بالا کام کی تکمیل اور حقیقتاً اس کی موجودگی میں بھی یہ کام ان اسلامی اقامت خانوں سے لیا جا سکتا ہے جن میں یونیورسٹیوں

اور کالجوں کے مسلم طلباء قیام کریں اور وہاں اسلامی تربیت اسلامی زندگی اور ماحول کے قیام اور صالح ذہنی اور روحانی غذا کے مہیا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے اقامت خانوں کا طلباء کی زندگی و سیرت اور ان کے اخلاق و رجحانات کی تشکیل میں جو گہرا حصہ ہے اس سے وہ حضرات بے خبر نہیں جو اس نسل کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں اسلامیہ اسکول اور کالج جن پر ملت کے سرمایہ اور توجہ کا قیمتی حصہ صرف ہو چکا ہے بہت جگہ حالات کی تبدیلی سے اپنی افادیت کھو چکے ہیں پھر اکثر وہ ، ، کوہ کندن و کار برآوردن ، ، کا مصداق ثابت ہوتے ہیں اس کے برعکس اقامت خانوں کی تاسیس و انتظام کی مشکلات کم اور فوائد زیادہ ہیں اور جہاں نظام تعلیم کا سر رشتہ صحیح الخیال اور درد مند مسلمان زعماء و قائدین کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور اس کے بازیاب کی جلد امید نہیں وہاں یہ اقامت خانے ہی زیر تعلیم مسلمان نوجوانوں کی اخلاقی حفاظت اور ذہنی و دینی تربیت کا سامان کر سکتے ہیں اور بہت سی سعید روحوں کو فاسد و مفسد ماحول اور مسخ کرنے والے نظام تعلیم اور مراکز تعلیم کی سمیت سے محفوظ رکھ سکتے ہیں ان اسلامی اقامت خانوں کی مسلم مغربی ممالک میں بھی ضرورت ہے جہاں وہ مسلمان نوجوان بڑی تعداد میں تعلیم پاتے ہیں جو ذہانت و قوت عمل میں ملت کا سرمایہ اور جوہر ہیں اور جن کے لیے بالعموم اپنی ذہنی صلاحیتوں اور مغربی علوم و السنہ و سیاست سے واقفیت کی بنا پر گویا مسلم ممالک کی قیادت اور کم سے کم ان کے قلیدی جگہیں مقدر ہو چکی ہیں اگر ان مرکزوں میں ان کے رجحانات کی اصلاح اور اسلامی ذہن کی تعمیر کا سامان کیا جا سکے اور اسلام اور اس کے مستقبل پر ان کا اعتماد بحال کیا جا سکے تو اس خاموش پیغام کے ذریعے اور اس خاموش کام کے ذریعے ان مسلم ممالک میں خاموشی کے ساتھ وہ اسلامی انقلاب لایا جا سکتا ہے جن کی قیادت دیر یا سویر یہ نوجوان سنبھالنے والے ہیں اور یہ طریقہ ان

تمام طریقوں سے زیادہ آسان اور محفوظ معلوم ہوتا ہے جن کا عرصہ سے براہ راست ان ممالک میں تجربہ کیا جارہا ہے۔

افغانستان کی موجودہ طالبان حکومت پر ایک نظر

ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا ہے کہ متمدن دنیا ان کو دیکھ رہی ہے کہ وہ خام اشیاء جو بکھری پڑی تھیں جن کی معاصر قوموں نے بھی ذرا قدر نہ کی اور پڑوسی ملکوں نے جن کا مذاق اڑایا تھا اس سے ایک مجموعہ تیار ہو گیا جو فی زماننا اس سے زیادہ متوازن و مکمل مجموعہ کمالات کہیں دکھائی نہیں دیتا ایسا مجموعہ جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی صلاحیت رکھتا ہے دین و دنیا کی ہر ضرورت کے لیے اس کے پاس سامان موجود ہے اس لیے اس کو کسی سے مدد کی ضرورت نہیں لیکن دنیا اس کی محتاج ہے۔

اس نوزائیدہ جماعت نے اسلامی تحریف کی بنیاد ڈالی ہے نئ اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی ہے حالانکہ اس کو اس سے پہلے اس کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا اس کے با وجود اس کو ذرا ضرورت نہ پڑی کہ کسی دوسری قوم سے کوئی آدمی مستعار لے یا کسی انتظام میں کسی حکومت سے مدد چاہے ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کا ڈنکا دنیا کے بڑے بڑے براعظموں میں ہونے لگا ہے اس کے ہر شعبہ اور ہر ضرورت کے لیے متعدد آدمی ایسے ہیں جو اپنی لیاقت ، کار کردگی، امانت، دیانت قوت اور احساس ذمہ داری میں بے نظیر ہیں ان میں کوئی عادل حاکم ہے کوئی امانتدار خازن اور کوئی منصف قاضی ہے کوئی عبادت گزار قائد ہے تو کوئی متقی فوجی اس ذہنی تربیت کی برکت سے جس کا کام مسلسل جاری ہے اور اس اسلامی دعوت کی مدد سے جو مستقل چل رہی ہے اس اسلامی حکومت کو اہل ترین خدا ترس فرض شناس اور مستعد کارکن مل رہے ہیں حکومت

کی ذمہ داری انہی اشخاص کے سپرد ہو رہی ہے جو ہدایت کو تحصیل وصول کے جذبہ پر ترجیح دیتے ہیں جو اپنے کو بجائے تحصیلدار کے مبلغ وہادی سمجھتے ہیں جن کی شخصیت میں صلاحیت و صلاح اور دین و دنیا کا صحیح امتزاج ہوتا ہے ان کے اثر سے اسلامی تہذیب ایک بار پھر اپنی پوری خصوصیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہو رہی ہے اور دین کے برکات وجود میں آرہے ہیں حقیقت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی کنجی انسانی فطرت کے قفل پر رکھ دی ہے جب وہ کھل جائے تو اس کے تمام خزانے عجائبات، طاقتیں اور کمالات دنیا کے سامنے آجاتے ہیں اور حالات و ہواؤں کا رخ بتا رہا ہے کہ ایک مرتبہ پھر اسلامی دور انسانی تاریخ پر چمکنی دمکنے ہی والا ہے لگتا ایسے ہی ہے کہ دنیا کی راہنمائی کی باگ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ان بیمار قوموں کو راہنمائی کے اس منصب سے معزول کرنے والے ہیں جس پر وہ قابض ہو گئ تھیں اور جس کو انہوں نے کبھی صحیح طور پر استعمال نہیں کیا ہے اب انہوں نے دنیا کے انسانوں کو اپنے ساتھ لے کر متوازن اور صحیح رفتار کے ساتھ منزل کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے ان میں وہ تمام صفات جمع ہیں جو ان کو قوموں کی راہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی ہیں مثلاً ان کے پاس آسمانی کتاب اور الہی شریعت ہے اس لیے ان کو اپنی طرف سے قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے اس طرح وہ جہالت و ناواقفیت روز روز کے قانونی رد و بدل اور ترمیم ہولناک غلطیوں اور مظالم سے محفوظ ہیں وہ اپنے سیاست و معاملات میں اندھا دھند چلنے اور اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور نہیں ہیں ان کے پاس وحی اور شریعت الہی کی روشنی ہے جس کے سہارے وہ چلتے ہیں اور جس سے زندگی کی تمام راہیں اور اس کے موڑ ان کے لیے روشن ہیں ان کا ہر قدم روشنی میں پڑتا ہے اور منزل مقصود ان کو صاف نظر آتی ہے وہ الہی قانون کے مطابق فیصلے کرتے ہیں جب وہ کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اس کو

مال غنیمت یا لقمہ تر نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے ہیں۔

طالبان کی سب سے زیادہ متاثر کن بات ان کی بے تکلفی قناعت اور اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ ان کی بے لچک کمنٹمٹ ہے جس کے لیے وہ دنیا کی ہر قوت اور ہر دباؤ کا سامنا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں انہوں نے اپنے معیار زندگی کو اتنا آگے بڑھایا ہی نہیں کہ انہیں عالمی مالیاتی اداروں کے سامنے جھولی پھیلانے پر مجبور ہونا پڑے جہاں ایک وفاقی وزیر کے ناشتہ میں دودھ کے بغیر چائے کے ساتھ رات کی بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے ہوں وہاں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کیا کریں گے ؟

یہی راز ہے طالبان کی کامیابی کا کہ انہوں نے اپنی چادر ماپ رکھی ہے اور اپنے پاؤں کو اس کی حدود کے اندر رہنے کا عادی بنا دیا ہے طالبان نے امن کے قیام کے لیے کوئی لمبی چوڑی محنت نہیں کی اور نہ ہی مختلف ملکوں میں کمیشن بھیج کر ان کی نظاموں کو سٹڈی کیا ہے بلکہ صرف دو کام کیے ہیں۔

1۔ تمام شہریوں سے اسلحہ واپس لے کر انہوں نے حد تک کر دیا۔

2۔ معاشرتی جرائم پر قرآن و سنت کی بیان کردہ شرعی سزاؤں کو عملاً نافذ کر دیا ہے۔

اس بارے میں انہوں نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا کسی وی آئی پی کا لحاظ نہیں کیا اور قانون کے سامنے کسی فرد یا گروہ کو سر نہیں اٹھانے دیا اس لیے وہ یہ بات کہنے کی پوزیشن میں ہے کہ ان کا علاقہ اس وقت دنیا کا سب سے پرامن علاقہ ہے۔

اہل مغرب و یورپ بار بار وقتاً فوقتاً حکومت پاکستان سے یہ دھمکی آمیز مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ طالبان حکومت سے فاصلہ رکھیں اور طالبان کی حمایت سے باز رہیں ورنہ انہیں نقصان اٹھانا پڑے گا اصل میں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک طالبان کی بے لچک اسلامی پالیسیوں سے نالاں ہیں اور ان کی انتہائی کوشش ہے کہ پاکستان کے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے طالبان حکومت کو اسلامی قوانین کے نفاذ میں لچک پیدا کرنے پر مجبور کیا جائے لیکن ایک طرف طالبان حکومت نے دو ٹوک اعلان کر دیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کسی قسم کی لچک پیدا نہیں کریں گے اور نہ ہی اس حوالے سے کسی کا دباؤ قبول کریں گے اور دوسری طرف حکومت پاکستان کے ذمہ دار حضرات واضح کر چکے ہیں کہ وہ طالبان حکومت سے برابری کی سطح پر ہی بات کر سکتے ہیں اور ان کی مرضی کے خلاف ان سے کوئی بات دباؤ کے ساتھ منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہے یہ صورتحال امریکہ اور اس کے حواری ممالک کے لیے پریشان کن ہوتی جا رہی ہے اور وہ تمام تر عالمی اثر و رسوخ اور سطوت و حشمت کے باوجود امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کے بارے میں بے بسی محسوس کرتے ہوئے مسلسل دانت پیس رہے ہیں مگر ہمیں یقین ہے کہ طالبان حکومت اگر اسلامی احکام و قوانین کے حوالے سے اپنے عزم پر قائم رہتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور وہ بالآخر دنیا کو ایک بار پھر اسلام کے عادلانہ نظام کا عملی نقشہ اور اسلامی سوسائٹی کی عملی شکل دکھانے میں کامیاب ہوں گے۔

اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں اور مغربی حکومتوں کے ساتھ ساتھ کم و بیش سب مسلم حکومتوں نے طالبان کے جائز اور اصولی مؤقف کے افغانستان کا مکمل کنٹرول ان کے زیر قبضہ ہے تو دنیا کے مسلمہ اصولوں کے مطابق انہیں افغانستان کی جائز حکومت کے طور پر تسلیم کیا جائے

کی حمایت کرنے کی بجائے بین الاقوامی دباؤ کا ساتھ دینے میں عافیت سمجھی ہمارے نزدیک مغربی حکومتوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ کابل کا اقتدار صرف طالبان کے پاس نہ ہو بلکہ مختلف نسلی گروہوں کے نام سے ایسے حضرات کو بھی حکومت کا حصے دار بنایا جائے جو افغانستان کو خالص اسلامی اور مولویانہ ، ، ریاست بننے سے روک سکیں ہمارے خیال میں یہ ایک غیر منصفانہ اور غیر اصولی مطالبہ ہے اگر ایسا کیا گیا تو طالبان عسکری میدان سے تو فارغ ہو چکے ہیں مگر انہیں خالص اسلامی ریاست بنانے کے لیے پھر ٹیبل ٹاک اور ڈپلومیسی کی جنگ لڑنا پڑے گی جو سوائے ان کے وقت کے ضیاع اور ان کو الجھانے کے کسی مثبت نتائج کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو گی۔

مآخذ و مصادر

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام
1	مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش	مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ
2	اصول الغزوالفکری یعنی نظریاتی جنگ کے اصول	مولانا اسماعیل ریحان
3	اسلام اور سیکولرزم	ڈاکٹر محمد یوسف القرضاوی
4	اسلام اور دور حاضر کے شبہات و مغالطے	مفتی عمر انور
5	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے و عروج و زوال کا اثر	مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ
6	اسلام اور انسانی حقوق اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں	مولانا زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہم العالیہ
7	ماہنامہ شریعت	
8	کالم	مولانا ابو عمار زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہم العالیہ

عمران فاروقی

کی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

مشرق اور مغرب کی کشمکش

مولانا عمران فاروقی صاحب
مظفر گڑھ